
CONFIDENTIAL
MEDICAL
MAFIA

بسمہ اللہ الرحمن الرحیم



نور راجپوت





باب دوم

CHAPTER #II

رتق

بعض حقیقتیں دفن نہیں کی جاسکتیں، انہیں بس سی دیا جاتا ہے۔
وقت ان پر تہہ در تہہ مٹی ڈال دیتا ہے، لوگ انہیں بھول جانے کا نام دے دیتے ہیں اور دنیا آگے بڑھ جاتی ہے۔ ان کے گرد خاموشیوں کی دیوار کھڑی کر دی جاتی ہے۔ گواہیوں کو خاموش کر دیا جاتا ہے، نام مٹا دیے جاتے ہیں اور واقعات کو اس طرح جوڑ دیا جاتا ہے کہ سچ اور جھوٹ ایک ہی وجود محسوس ہونے لگیں۔
لوگ اسے فراموشی سمجھتے ہیں حالانکہ یہ فراموشی نہیں، رتق ہے۔ ایک ایسا بندھن جس میں زخم بھرے نہیں ہوتے صرف بند کر دیے جاتے ہیں۔
ایک ایسی خاموشی جس کے نیچے سوال زندہ رہتے ہیں۔ ایک ایسا اندھیرا جس میں حقیقت سانس تو لیتی ہے مگر دکھائی نہیں دیتی۔
لیکن ہر رتق کے مقدر میں ابدی خاموشی نہیں لکھی جاسکتی۔
کیونکہ سچائی کی ایک فطرت ہے۔ وہ قید رہ سکتی ہے، فنا نہیں ہوسکتی۔ اور جب وقت اپنی گرفت ڈھیلی کرتا ہے تو برسوں سے سی ہوئی دراڑیں آہستہ آہستہ کھلنے لگتی ہیں یہاں تک کہ ایک دن ماضی خود اپنے کفن کی سلائیاں ادھیڑ کر باہر آجاتا ہے۔

ماضی کا ایک دھندلا غبار آلود منظر آہستہ آہستہ ذہن کے پردے پر واضح ہونے لگا۔ یہ
ایک جدید ترین اور پراسرار تجربہ گاہ کا منظر تھا۔ سفید بتیوں کی تیز روشنی ہر کونے کو منور کر رہی تھی۔ وہاں سینکڑوں لوگ سفید لیب کوٹ پہنے کمپیوٹر اسکرینز، ٹیسٹ ٹیوبز اور پیچیدہ بائیومیٹرک آلات کے ساتھ اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ اس سرد ماحول میں ایک بارعب اور بلند قامت شخص ایک بارہ سالہ لڑکے کی انگلی پکڑے نپے تلے قدموں سے داخل ہوا۔ اس لڑکے کی گہری نیلے رنگ کی آنکھیں حیرانی اور خوف کے ملے جلے تاثرات سے اس وسیع و عریض جگہ کو دیکھ رہی تھیں۔

"داجی! ہم کہاں جا رہے ہیں؟" لڑکے نے اپنے ساتھ چلتے ہوئے شخص کا دامن ہلکے سے کھینچتے ہوئے معصومیت سے پوچھا۔

اس بارعب شخصیت کے مالک شخص نے نیچے دیکھا، اس کے لہجے میں ایک عجیب سی سرد مہر محبت تھی، "تمہیں حازق سے ملنا ہے نا؟"

"ہاں..." حازق کا نام سنتے ہی اس بارہ سالہ بچے کی اداس آنکھیں یکدم چمک اٹھیں۔ اس کے چہرے پر ایک والہانہ خوشی لہرائی۔ وہ شخص اسے لے کر ایک بڑے کمرے کے سامنے آکر رک گیا، جس کی سامنے والی پوری دیوار شفاف شیشے کی بنی ہوئی تھی۔ اس شیشے کے پار ایک

سولہ سالہ لڑکا ساکت بیٹھا تھا۔ وہ ڈاؤن سنڈروم کا شکار تھا مگر اس کی شخصیت میں ایک عجیب سی طہارت اور صفائی تھی۔ سفید رنگت، سفید شرٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس وہ لڑکا حد درجہ معصوم اور وجیہہ لگتا اگر اس کے چہرے کے خدوخال اس موروثی بیماری کے باعث بدلے ہوئے نہ ہوتے۔ اس کے آس پاس کئی ڈاکٹرز چوکنے کھڑے تھے اور اسکرین پر چلتے ہوئے اس کے دماغی ڈیٹا کا باریکی سے معائنہ کر رہے تھے۔

" کیا حازق ٹھیک ہو جائے گا، داجی؟" نیلے آنکھوں والے بچے نے شیشے کی سرد دیوار پر اپنے دونوں چھوٹے ہاتھ رکھے اور انتہائی امید سے اپنے بڑے بھائی کو دیکھنے لگا۔

لیکن اگلے ہی لمحے شیشے کے پار کا منظر ہولناک ہو گیا۔ حازق اچانک بے طرح مچلنے لگا۔ اس کا معصوم وجود نرسوں اور میڈیکل اسٹاف کے چنگل میں تڑپ اٹھا۔ وہ بری طرح ہاتھ پاؤں مار رہا تھا، اپنے ہی بال نوچنے کی کوشش کر رہا تھا مگر ان سنگدل ڈاکٹروں اور اسٹاف نے اسے بے رحمی سے جکڑ رکھا تھا۔ شیشے کے اس پار کھڑا چھوٹا لڑکا یہ دیکھ کر رونے لگا مگر اس کے عقب میں کھڑے شخص کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا۔

منظر نے ایک بار پھر کروٹ لی۔ وقت کی بساط پر دو سال مزید بیت چکے تھے اور وہ بارہ سالہ لڑکا اب چودہ سال کا تھا مگر اب وہ شیشے کے باہر نہیں تھا۔ ایک تاریک، اسٹرلائزڈ راہداری میں وہ چودہ سالہ نوجوان خود ڈاکٹروں اور وارڈن کے ایک مضبوط نرغے میں پھنسا ہوا تھا۔ اس کا اپنا وجود کسی قیدی کی طرح جکڑا ہوا تھا۔ وہ ان کے ہاتھوں میں بری طرح مچل رہا تھا۔ اس کے پاؤں فرش پر پھسل رہے تھے اور اس کا گلا چیخ چیخ کر بیٹھ چکا تھا۔

"حازق...حازق...!"

اس کی آواز ہسپتال کی سنسان راہداریوں میں گونج رہی تھی۔ اس نے سامنے لیکن دور کھڑے اپنے داجی کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، وہ گڑگڑاتے ہوئے التجا کر رہا تھا۔

"داجی...پلیز...مُجھے جانے دیں! مُجھے حازق کو ڈھونڈنا ہے....وہ حازق...مُجھے اس کے پاس جانا ہے...داجی...حازق...!!

وہ بے طرح مچل رہا تھا، چیخ رہا تھا، چلا رہا تھا۔ اپنے ناخنوں سے ان کے ہاتھوں کو زخمی کر رہا تھا لیکن نرسوں کے اس بے رحم نرغے نے اسے ایک انچ بھی آگے بڑھنے نہیں دیا۔ سائنس اور خاندانی غرور کے اس حصار نے اسے وہیں دفن کر دیا۔

منظر پھر سے بدلا۔اب پسِ منظر میں مشینیں دھیمی اور پراسرار آوازیں پیدا کر رہی تھیں۔ایک سفید، کلینیکل بستر پر اب ڈاؤن سنڈروم کا شکار وہ معصوم لڑکا نہیں تھا بلکہ اس کی جگہ ایک بالکل نارمل، خوبصورت اور تندرست لڑکا لیٹا ہوا تھا۔وہ گہری بے ہوشی کی حالت میں تھا۔اس کے سر پر بے شمار الیکٹروڈز اور تاریں جڑی ہوئی تھیں اور سامنے لگی بڑی اسکرین پر اس کے دماغ کے نیورونز اور برین ریڈنگز ایک طوفانی رفتار سے چل رہی تھیں۔کمرے کے وسط میں وہی مقناطیسی اور خوفناک حد تک بااثر شخصیت کا مالک شخص (داجی) ڈاکٹروں کے چیف پینل کے پاس کھڑا تھا۔اس کی آنکھوں میں کوئی رحم نہیں بلکہ ایک جنونی مقصد تھا۔

"ہمیں اس کے Behaviour کو Evolve کرنا ہوگا۔"اس شخص نے اپنے کوٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے، حد درجہ ٹھنڈے لہجے میں کہا۔"مُجھے کسی بھی صورت یہ ایک عام، جذباتی انسان نہیں چاہیے۔اس کے اندر سے کمزوری کا آخری مہرہ بھی نکال پھینکو...
Make him a monster.(اسے ایک مونسٹر بنادو!)"

ڈاکٹروں کے سر اثبات میں ہل گئے اور اسکرین پر چلنے والی ریڈنگز کا رنگ یکدم سرخ ہو گیا۔پھر منظر آخری بار بدلا اور یہ سب سے ہولناک تھا۔

ایک بہت بڑا لوہے کا قدیم پل تھا جس کے نیچے دریا کا طوفانی اور بپھرا ہوا پانی کسی بکے ہوئے لشکر کی طرح تیز رفتار سے بہہ رہا تھا۔آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اور تیز طوفانی بارش نے ہر طرف ایک سنسناہٹ پھیلا دی تھی۔پل کے بالکل کنارے پر بارش میں پوری طرح بھیگا ہوا، وہ ڈھیلی جسامت والا، ڈاؤن سنڈروم کا شکار حازق کھڑا تھا۔اس کا سفید لباس جسم سے چپک چکا تھا اور اس کی آنکھیں دریا کے اس سیاہ پانی کو گھور رہی تھیں۔

"حازق نو....حازق نو..."

وہ چودہ سالہ نیلی آنکھوں والا لڑکا پل کی دوسری طرف سے دیوانہ وار بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔اس کا دل حلق میں اٹک چکا تھا، چہرے پر ایک ایسی دہشت تھی جو زندگی بھر پیچھا نہیں چھوڑتی۔وہ اپنے بڑے بھائی کو روکنے کے لیے تڑپ رہا تھا۔جیسے ہی اس نے حازق کی طرف اپنے کانپتے ہوئے قدم بڑھائے، حازق نے مڑ کر اسے دیکھا...اس کے چہرے پر ایک آخری معصوم سی الوداعی مسکراہٹ ابھری۔اور اس سے پہلے کہ وہ چھوٹا بھائی اس کا ہاتھ پکڑ پاتا...حازق نے ایک ہلکی سی پرواز لی اور دریا کی ان طوفانی ہوئی لہروں کے رحم و کرم پر نیچے کود گیا۔

"حازق.....!!!"

اس آخری بھیانک چیخ کے ساتھ ہی ریشمی بستر پر سویا ہوا وہ شخص ایک زوردار جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔اس کی وہ لرزہ خیز چیخ کشادہ اور تاریک بیڈ روم کے درودیوار سے ٹکرا کر گونج اٹھی۔حق بزدار کا پورا وجود اس وقت پسینے سے بری طرح بھیگا ہوا تھا جیسے وہ ابھی ابھی اسی طوفانی دریا سے نکل کر آیا ہو۔اس کے وجیہہ چہرے پر اس وقت مہیب دہشت نقش تھی۔اس کے مضبوط ہاتھ اور پاؤں بری طرح کپکپا رہے تھے۔دل کی دھڑکن اتنی تیز تھی کہ پسلیاں ٹوٹنے کا احساس ہوا۔اس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھے۔

"حازق..."اس کے لرزتے لبوں سے وہ نام ایک دھیمی سی سسکتی ہوئی سرگوشی کی طرح پھسلا۔اس کی ان گہری نیلی آنکھوں میں اس وقت لازوال نمی ابھری۔

"حازق..."اس نے زیرِلب اس نام کو دہرایا جیسے وہ اس اندھیرے کمرے میں اپنے بھائی کی روح کو پکار رہا ہو۔رگ وپے میں اذیت ہی اذیت تھی۔کاش حازق کہیں سے آسکتا۔کاش اس روز وہ اسے پکڑ سکتا۔کچھ دیر بعد اس نے کانپتے ہاتھوں سے سائیڈ ٹیبل پر رکھی اسمارٹ واچ کی اسکرین کو روشن کیا۔سرخ ہندسے رات کے سناٹے میں چمک اٹھے۔۹ مارچ رات کے سوا نو بجے رہے تھے۔اس نے بیڈ سے پشت ٹکائی اور اندھیرے کو گھورنے لگا۔کاش...کاش وہ دن،۱۱ مارچ کی وہ رات اس کی زندگی میں کبھی نہ آئی ہوتی۔وہ دن جو اس سے اس کا سب سے بڑا مان،اس کا معصوم بھائی،اس کا حازق چھین کر لے گیا اور اسے ہمیشہ کے لیے ایک بے حس مونسٹر بننے پر مجبور کر گیا۔۱۱ مارچ قریب تھا۔بساطِ رتق کھل چکی تھی اور الفا اپنے ہی ماضی کے زہر کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ چکا تھا۔

اس نے ریشمی چادر کو ایک طرف ہٹایا اور بستر سے اترا۔اس کا توازن اب بھی بحال نہیں ہوا تھا۔۔ماضی کے اس بھیانک ڈراؤنے کابوس نے اس کے مضبوط اعصاب کی بنیادیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔بیس منٹ بعد وہ تولیے سے چہرہ خشک کرتا ہوا جیسے ہی واپس اپنے تاریک بیڈ روم میں داخل ہوا،سائیڈ ٹیبل پر رکھا اس کا فون یکدم بج اٹھا۔
اس نے آگے بڑھ کر فون اٹھایا،اسکرین پر شہر کے سب سے بڑے سائیکاٹرک اینڈ جنرل ہسپتال کا ایمرجنسی نمبر چمک رہا تھا۔اس کی پیشانی پر گہری لکیریں ابھر آئیں۔اس نے چند لمحوں کے توقف کے بعد کال ریسیو کر کے فون کان سے لگایا۔

"ہیلو؟"

"مسٹرحق بزدار؟" دوسری جانب سے پوچھا گیا۔

"اسپیکنگ ..."

"مسٹر بزدار! معذرت چاہتے ہیں آپ کو رات کے اس پہر زحمت دی۔" دوسری جانب سے ہسپتال کے چیف ڈیوٹی ڈاکٹر کی آواز ابھری۔
"لیکن یہاں ایک انتہائی عجیب کیس آیا ہے۔ ہمارے ہاں صبح ایمرجنسی میں ایک ڈاؤن سنڈروم کا شکار شخص لایا گیا تھا جس کی عمر قریباً اڑتیس سال ہے اور وہ اپنی یادداشت مکمل طور پر بھول چکا ہے۔
آپ نے جو حلیے میں ہمیں دیا تھا، یہ مریض اس سے کافی حد تک ملتا جلتا ہے تو کیا آپ..."
ڈاؤن سنڈروم...اڑتیس سال کی عمر....اور یادداشت کا غائب ہونا!

ان الفاظ نے حق کے ذہن کے اندر سالوں سے سیے ہوئے رتق کو ایک ہی جھٹکے میں ادھیڑ کر رکھ دیا۔ اس نے بنا کچھ سوچے سمجھے، گاڑی کی چابیاں میز سے اٹھائیں اور کمرے سے باہر کی طرف بھاگا۔

"میں آرہا ہوں۔"

اس کا چہرہ خوف اور امید کی ایک ہولناک جنگ کے باعث بالکل سفید پڑ چکا تھا۔ کچھ دیر بعد رات کی سنسان سڑکیں اس کے جنون کی گواہ تھیں۔ اس کا دل پسلیوں سے ٹکرا رہا تھا اور دماغ میں صرف ایک ہی نام گونج رہا تھا۔

"حازق...حازق...!" کیا معجزے واقعی ہوتے ہیں؟ کیا دریا کی وہ بپھری لہریں اس کے بھائی کو واپس لوٹا سکتی تھیں؟ اسی کشمکش میں اسکا سفر جانے کیسے کٹا۔ اسکے موبائل پر مطلوبہ وارڈ اور کمرہ نمبر کا پتہ پیغام کی صورت آچکا تھا۔ ہسپتال پہنچ کر اس نے گاڑی کو اس طرح روکا کہ ٹائروں کی چڑچڑاہٹ نے ہسپتال کے سائلنٹ زون کو ہلا کر رکھ دیا۔ وہ کسی پاگل کی طرح راہداریوں کو چیرتا ہوا استقبالیہ کے عملے کو نظر انداز کر کے سیدھا مطلوبہ وی آئی پی وارڈ کی طرف بھاگا۔ جیسے ہی وہ مطلوبہ کمرے کے سامنے پہنچا، اس کے ہانپتے ہوئے قدم ایک پل کو منجمد ہو گئے۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے دروازے کا ہینڈل نیچے کیا اور اندر داخل ہو گیا۔ سامنے بیڈ کے پاس لگی کرسی پر، سفید ہسپتال کے لباس میں ملبوس وہ شخص بیٹھا تھا۔ اس کی پشت حق کی طرف تھی۔ حق کے وجود میں جیسے بے تابی کا ایک لاوا پھوٹ پڑا۔ وہ تمام تر دوریوں اور اصولوں کو پسِ پشت ڈال کر دیوانہ وار اس کی طرف لپکا۔ اس نے پیچھے سے جا کر اس شخص کے کندھوں کو پکڑا اور اسے اپنی طرف موڑا۔ اس

نے اپنے دونوں مضبوط ہاتھوں کے پیالے میں اس شخص کا چہرہ لیا اور انتہائی گہرائی سے اس کی آنکھوں میں جھانکا، اس کے چہرے کے خدوخال کو پہچانے کی کوشش کی...ڈاؤن سنڈروم کی وہی مخصوص معصومیت، وہی سفید رنگت! حق کی سانسیں رک گئیں۔ایک پل کو لگا جیسے یہی حازق ہو مگر عقل اور الفا کا تجربہ اب بھی ایک حتمی گواہی مانگ رہا تھا۔اس نے تڑپ کر اس شخص کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا اور اس کے لباس کی آستین کو اوپر کی طرف کھینچا۔اس کی نظریں اس شخص کی گوری کلائی پر جم گئیں۔کلائی بالکل صاف تھی۔مکھن کی طرح ملائم اور بے داغ۔وہاں کسی قسم کا کوئی نشان نہیں تھا۔

حق کا پورا وجود ایک شدید جھٹکے سے پیچھے ہٹا جیسے اسے ہزاروں وولٹ کا کرنٹ لگا ہو۔اس کے قدم بری طرح لڑکھڑائے اور وہ پیچھے رکھی میز سے جا ٹکرایا۔اس کی آنکھوں میں امید کی جو چمک ابھری تھی وہ ایک پل میں راکھ کے ڈھیر میں بدل گئی۔

"یہ...یہ...حازق نہیں ہے!"

اس کا چہرہ مسخ ہو چکا تھا اور آنکھوں میں شدید ترین مایوسی پھیل گئی تھی۔اس نے اس انجان شخص کو دیکھا جو اسے بڑی معصومیت سے گھور رہا تھا اور پھر اپنے ٹوٹے ہوئے مان کے ساتھ، حق بزدار الٹے قدموں اس کمرے سے باہر نکل گیا جبکہ ہسپتال کے اس سرد کمرے کی خاموشی الفا کی اس سب سے بڑی ہار پر قہقہے لگا رہی تھی اور رتق کی سلائیاں ایک بار پھر اور زیادہ مضبوطی سے سی دی گئی تھیں۔

☆...☆...☆

وہ ہسپتال کی راہداریوں سے کسی چلتے پھرتے بے جان مجسمے کی طرح باہر نکلا۔اس کا پورا وجود شدید ذہنی انتشار اور غیر دماغی کا شکار تھا۔وہ ٹرانس کی سی کیفیت میں اپنی گاڑی میں بیٹھا اور کانپتے ہاتھوں سے چابی گھمائی مگر انجن نے ایک دھیمی بے جان سی گھر گھراہٹ کے بعد جواب دے دیا۔اس نے دوبارہ کوشش کی مگر گاڑی شروع نہیں ہوئی۔ہسپتال کے مرکزی ریسیپشن پر لگی ڈیجیٹل اسکرین اگلے دو دن تک شہر میں شدید طوفانی برسات اور ہائی الرٹ کی پیشین گوئی کر رہی تھی اور حق کے باہر قدم رکھتے ہی آسمان کا رنگ بدل چکا تھا۔بادل گرج رہے تھے مگر اس کے چہرے پر اس وقت آسمان سے زیادہ ہولناک اذیت کے آثار تھے۔اس کا مان ایک بار پھر ٹوٹا تھا، اس کا حازق اسے نہیں ملا تھا۔اس نے بے اختیار سانس لی، گاڑی کو وہیں پارکنگ میں چھوڑا اور پیدل ہی سڑک کے کنارے چل پڑا۔اسے اس وقت پرواہ نہیں تھی کہ سرد ہوا کے تھپیڑے اس کے چہرے پر لگ رہے تھے۔وہ جانے کتنی دیر تک، گم سم سا سڑک کے کنارے چلتا رہا یہاں تک کہ اس کے اعصاب شل ہونے لگے۔اسی لمحے اس کے ٹراؤزر کی جیب میں رکھا فون وائبریٹ ہوا۔اس نے بنا دیکھے فون کان سے لگایا۔وہ اقبال کی کال تھی۔

"حق! کہاں ہو تم؟"

اقبال کی فکرمند اور بھاری آواز نے جیسے حق کو اس کے خوابِ غفلت سے کھینچ کر دوبارہ دنیا کے ہوش میں لا پٹخا۔ اس نے جھٹکے سے اپنی مخمور آنکھیں کھولیں اور ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ سڑک کے پار، زرد اور سفید لائٹس سے جگمگاتی ہوئی ایک بہت بڑی فارمیسی تھی۔ بالکل اسی پل بادل ایک ہولناک دھماکے سے گرجے اور یک لخت موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ راہ چلتے لوگ، بائیک سوار اور دکاندار ادھر ادھر پناہ کی تلاش میں دیوانہ وار بھاگنے لگے۔ حق نے اسی غیر دماغی کے عالم میں سامنے لگی فارمیسی کا نام پڑھ کر اقبال کو بتایا۔

"تم وہیں رکو، میں آتا ہوں۔" اقبال نے فوراً کہا اور لائن کٹ گئی۔

حق ایک گہرا اور بوجھل سانس لیتا ہوا فارمیسی کی جانب بڑھ گیا۔ اسے بارش سے شدید اور ذاتی نفرت تھی۔ یہ پانی کے قطرے اس کے وجود کے لیے کسی پگھلے ہوئے زہر کی مانند تھے کیونکہ ہر بار جب بھی آسمان روتا، وہ حق کے پرانے زخموں کو بے رحمی سے کرید دیتا تھا۔ بارش کے دن ہی تو حازق اس سے ہمیشہ کے لیے بچھڑا تھا۔ بارش کی وجہ سے ہی دریا کی ان بے لگام، بپھری ہوئی لہروں نے اس کے معصوم بھائی کو اپنے اندر نگل لیا تھا۔ وہ فارمیسی کے سامنے بنے ایک وسیع کنکریٹ کے شیڈ کے نیچے آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک بڑی اور جدید فارمیسی تھی اور اس کے سامنے بنے سیمنٹ کے زینوں کے قریب موٹر سائیکل کھڑی تھی جس پر بارش کا پانی تیزی سے بہہ رہا تھا۔ وہ وہاں غیر دماغی سے کھڑا ہو گیا۔ بارش تیزی سے برسنے لگی۔ اسے وہاں کھڑے ہوئے ابھی چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ فارمیسی کا خودکار شیشے کا دروازہ ایک ہلکی سی سرسراہٹ کے ساتھ کھلا۔ اندر کی ٹھنڈی، طبی مہک باہر آئی اور اس کے ساتھ ہی بالوں کو پیچھے ایک چھوٹے سے جوڑے میں قید کیے، ایک مضبوط جسامت کا حامل شخص باہر نکلا۔ اس کے ایک ہاتھ میں دوائیوں کا پیکٹ تھا جبکہ دوسرا ہاتھ فون سمیت کان سے لگا ہوا تھا۔

"چاچو! باہر بارش بہت تیز ہو چکی ہے۔ برائے مہربانی تھوڑی دیر وہیں رک جائیں۔"

سقراط شبگیر نے اپنی آنکھیں سکیڑ کر باہر برستی تیز بارش کا جائزہ لیا، جہاں پانی کی موٹی دھاریں سڑک کو تالاب میں بدل رہی تھیں۔

"ٹھیک ہے۔" سقراط کا وہ مخصوص بھاری لہجہ فضا میں گونجا۔ وہ آگے بڑھنے کے بجائے وہیں شیڈ کے نیچے ٹھہر گیا۔ اور اس کے وجود سے محض تین چار قدموں کے فاصلے پر اپنے ٹراؤزر کی جیبوں میں دونوں ہاتھ ڈالے حق بزدار کھڑا تھا۔ قدرت کا مضحکہ خیز کھیل یہ تھا انجانے میں ہی

سہی مگر تاریخ کے وہ دوسب سے بڑے طاقتور مہرے آج ایک ہی شیڈ تلے، ایک ساتھ کھڑے بارش کے تھمنے کا انتظار کر رہے تھے۔ پورے دس سال بعد! ایک جانی پہچانی آواز پر ساتھ کھڑے حق بزدار کے اعصاب یکدم تن گئے۔ اس نے نہایت دھیمے انداز میں اپنا رخ موڑا اور برابر میں کھڑے اس شخص کو دیکھا۔ ہاں...وہ کوئی اور نہیں، وہ سقراط ہی تھا! وہی تیکھے نقوش، وہی مغرور انداز اور وہی شبگیر خاندان کا خون! وہ جانے کتنے ثانیے اسے دیکھتا رہا۔ فون پر مصروف سقراط نے ایک انجان احساس کے تحت اچانک اپنا رخ موڑا۔ جیسے ہی اس کی نظریں دائیں جانب کھڑے حق بزدار پر پڑیں، وہ کیسے ساکت رہ گیا۔ اسے دور دور تک یہ اندازہ نہیں تھا کہ رات کے اس پہر، ایک فارمیسی کے شیڈ تلے یوں اچانک ان کی ملاقات ہو جائے گی۔

ٹپ...ٹپ...ٹپ...

وقت کی رفتار جیسے یکدم کسی بریک کی طرح رک گئی۔ شیڈ کے اس کنکریٹ کے کنارے سے گرتی ہوئی بارش کی موٹی بوندیں جیسے فضا میں معلق ہو کر بالکل سست ہو گئیں۔ ان بوندوں کے ٹپکنے کی آواز دونوں کے درمیان کے مہیب سناٹے میں گونجنے لگی۔ حق جو پہلے ہی حازق کے غم میں ایک گہری اذیت سے گزر رہا تھا، سقراط کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر اس کے دل میں تکلیف کا احساس مزید تیز ہو گیا۔ ایک بے نام سا دکھ، ایک پرانی محرومی اس کے رگ و پے میں زہر کی طرح پھیل گئی۔ دوسری طرف، سقراط کی آنکھوں میں ایک سلگتے ہوئے آتش فشاں کے ساتھ ساتھ ڈھیروں شکوے اور تلخیاں ابھریں مگر اس نے فوراً اپنے لبوں کو سختی سے بھینچ کر خود پر قابو پایا۔ دونوں کی نظریں سیکنڈ کے دسویں حصے میں ایک دوسرے سے ٹکرائیں اور اس ٹکراؤ سے پیدا ہونے والی چنگاری نے وقت کو الٹا گھما دیا۔ ماضی کسی پرانی کلاسک فلم کے مناظر کی طرح ان کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔

یہ ایک وسیع و عریض کھیل کا میدان تھا۔ کالی گھٹائیں چھائی تھیں اور تیز طوفانی بارش کے درمیان ایک بائیس سالہ نوجوان زمین پر گرا ہوا تھا۔ اس کا سانس اکھڑ رہا تھا اور وہ درد سے تڑپ رہا تھا جبکہ اس کے اوپر ایک دوسرا لڑکا جھکا ہوا تھا جس کے ہاتھ میں ہاکی اسٹک تھی۔

"ہیلو! تم ٹھیک ہو؟" لمبے بالوں والے لڑکے نے اپنی ہاکی ایک طرف پھینک کر زمین پر پڑے لڑکے کا گال ہلکے سے تھپتھپایا تھا۔ زمین پر پڑا وہ نیلی آنکھوں والا لڑکا اپنے سینے پر ہاتھ رکھے تیزی سے سانس لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ ان دونوں کی زندگی کی پہلی ملاقات تھی۔

منظر نے ایک بار پھر جھٹکا کھایا اور وہ دونوں واپس حال کی تلخ حقیقت میں آمنے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ اسٹریٹ لیمپوں کی زرد روشنی میں برستی بارش کے قطرے فضا میں چمکتے ہوئے ہیروں کی طرح لگ رہے تھے جن کے پار برابر قد و قامت اور مضبوط جسامت والے دو مرد

ایک دوسرے کے مقابل کھڑے تھے۔

"تم ؟" حق کے لبوں سے بے ساختہ پھسلا۔

" کیوں؟ مُجھے دیکھ کر چونک گئے؟" سقراط کے لبوں پر انتہائی تمسخرانہ اور کاٹ دار مسکراہٹ ابھری۔ "میرے زندہ ہونے پہ شاکڈ ہو حق بزدار؟"

حق نے بوجھل سانس لینے کی کوشش کی۔ وہ اس وقت کمزور لمحے کی گرفت میں تھا۔ اس کا روایتی تکبر جیسے کہیں کھو گیا تھا۔ اس نے دھیمے سے کہا۔

"تم آج بھی نہیں بدلے..."

" مگر تم ایک عرصہ پہلے بدل گئے تھے۔"

"میں نے تمہارے ساتھ کبھی کچھ غلط نہیں کیا۔"

" کاش تم نے میرے لیے کچھ کیا ہوتا حق بزدار! افسوس بھی تو یہی ہے کہ تم نے کچھ نہیں کیا۔" سقراط نے ایک قدم آگے بڑھایا اور اپنا ہاتھ، حق کے چوڑے سینے پر رکھ کر ایک معنی خیز دستک دی۔ حق یونہی ساکت کھڑا رہا، ہلکا سا ٹیڑھا بغیر کسی مزاحمت کے وہ سقراط کو اور اس کے ہاتھ کی اس دستک کو دیکھتا رہا۔

"ہم بہترین دوست تھے، سقراط..." حق کی آواز میں پرانے کرب کی تپش تھی۔

"لیکن اب ہم بدترین دشمن ہیں!" سقراط نے فوراً اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر حقارت کی ایک لہر ابھری۔

"اور جب دوست تمہارے جیسے ہوں تو پھر دشمنوں کی ضرورت نہیں رہتی۔"

"بہت سال گزر گئے...سب بھول جاؤ۔آگے بڑھو!"

"میں بھی تم سے یہی کہوں گا حق بزدار!سب بھول جاؤ اور میرے راستے میں مت آنا۔"

سقراط ایک سلگتی نگاہ اس پر ڈال کر آگے بڑھ گیا۔موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور تیز،طوفانی بارش کے بیچ تیز آواز سے وہاں سے نکلتا چلا گیا جبکہ پیچھے شیڈ کے نیچے حق بزدار بالکل اکیلا،تنہا کھڑا رہ گیا۔ایک...دو...تین...جانے کتنے لمحے اسی طرح خاموشی سے بیت گئے۔حق اسی پوزیشن میں ہلکا سا ٹیڑھا کھڑا برستی بارش کو دیکھتا رہا،یہاں تک کہ ایک لمبی سیاہ گاڑی تیز رفتاری سے آ کر فارمیسی کے سامنے رکی۔
گاڑی کا دروازہ کھلا اور اقبال باہر نکلا۔وہ بارش کی پروا کیے بغیر بھاگتا ہوا شیڈ کے نیچے حق کے سامنے آ کر رکا۔

"تم ٹھیک ہو،حق؟"اقبال نے حق کی ان گہری،سرخ پڑتی ہوئی نیلی آنکھوں کو دیکھا جن میں اس وقت وحشت اور دکھ کا ایک طوفان تھا۔حق نے بنا کچھ کہے،اثبات میں سر ہلایا۔وہ دونوں خاموشی سے گاڑی کی طرف بڑھے اور اندر بیٹھ گئے۔گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور بھیگی شاہراہ پر تیز رفتاری سے دوڑنے لگی۔گاڑی کی ونڈ اسکرین پر وائپر یکساں رفتار سے چل رہا تھا جبکہ حق نے اپنا رخ موڑ کر گاڑی کے دھندلے،پانی سے بھرے شیشے سے باہر کی سیاہ رات کو دیکھنے کی کوشش کی جہاں شہر کی روشنیاں پگھل رہی تھیں۔

"تم یہاں کیوں آئے تھے؟"اقبال نے اسٹیئرنگ وہیل پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے دھیمے سے پوچھا۔

"حازق کو ڈھونڈنے..."حق کے لبوں سے یہ لفظ ہمیشہ کی طرح ایک جنون کی شکل میں نکلا۔اقبال نے شدید ضبط سے اپنی آنکھیں میچ لیں۔اس کے چہرے پر ایک کرب ابھرا۔

"تم یہ کیوں بھول جاتے ہو حق کہ حازق یہاں پاکستان میں گم نہیں ہوا تھا؟تم بالکل بھول چکے ہو کہ وہ..."

اقبال کہنا چاہتا تھا کہ وہ مر چکا ہے وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے مگر حق کے چہرے کی ویرانی دیکھ کر وہ لفظ اپنی زبان پر نہیں لایا۔وہ حق کو مزید توڑنا نہیں چاہتا تھا۔
اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی حق بزدار پاگلوں کی طرح اسے ڈھونڈ رہا تھا۔وہ دنیا کے ہر اس کونے،ہر اس ہسپتال میں پہنچ جاتا تھا جہاں

سے اسے کسی گمشدہ ڈاؤن سنڈروم کے شکار شخص کی ذرا سی بھی خبر ملتی تھی۔اس نے حازق کا پتہ بتانے والے پر کروڑوں کا انعام رکھا ہوا تھا کیونکہ اس کا ضمیر، اس کا دل یہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھا کہ حازق مر چکا ہے۔ اس نے اس پل سے کود کر خودکشی کر لی تھی۔

"ہوش میں آؤ حق! ہوش میں آؤ۔" اقبال نے گہرا سانس لیتے ہوئے ایک ہاتھ اسکے کندھے پر رکھ کر جھنجھوڑا۔حق نے ایک لرزتی ہوئی سانس لی اور خود کو اس جان لیوا اذیت سے نکالنے کی کوشش کی مگر اس کا سینہ اب بری طرح تنگ پڑ رہا تھا، جیسے آکسیجن ختم ہو رہی ہو۔اس کے مضبوط ہاتھ بری طرح کپکپا رہے تھے اور سردی کی شدت سے اس کے ہونٹ نیلے پڑنے لگے۔اس کا بلڈ پریشر خطرناک حد تک گر رہا تھا۔

"تم نے اپنی میڈیسن لی؟" اقبال نے حق کی حالت دیکھتے ہی گاڑی کو فوری طور پر سڑک کے ایک کنارے روکا۔حق کچھ نہیں بولا، وہ بس شیشے سے سر ٹکائے اکھڑتی سانسوں کے ساتھ اندھیرے کو دیکھ رہا تھا۔

"تمہیں اس کی ضرورت ہے، حق!"

اقبال نے ڈیش بورڈ کھولا اور اندر سے ایک سفید رنگ کی شیشے کی ڈبی نکالی۔اس ڈبی کے اندر چھوٹی چھوٹی، چمکدار سفید گولیاں موجود تھیں۔ اقبال نے حق کی کانپتی ہوئی ہتھیلی کو زبردستی آگے کیا اور اس پر چند سفید گولیاں انڈیل دیں۔

"تم جانتے ہو نا کہ تم ان گولیوں کے بنا جی نہیں سکتے۔انہیں وقت پر لیا کرو۔" اقبال کے لہجے میں ایک مخلص دوست کی التجا تھی۔

حق نے کسی ٹرانس کی کیفیت میں بغیر کسی اعتراض کے وہ گولیاں منہ میں ڈالیں اور نگل لیں۔اقبال نے ڈیش بورڈ سے پانی کی ایک چھوٹی بوتل کھول کر اسے تھمائی۔ چند منٹوں بعد جیسے ہی کیمیکل نے حق کے خون میں شامل ہونا شروع کیا، اس کے اعصاب کا طوفان دھیما پڑنے لگا۔اقبال نے ایک آہ بھری اور گاڑی دوبارہ اسٹارٹ کر کے شاہراہ پر ڈال دی۔ باہر بارش ابھی بھی اسی طرح بے رحمی سے جاری تھی اور رتق کی اس بساط پر الفا ایک بار پھر گولیوں کے سحر میں خاموش ہو چکا تھا۔

☆...☆...☆

شبگیر ہاؤس کے لان پر چند گھنٹے پہلے تک جس مائیوں کی تقریب کی دھوم تھی، اب وہاں صرف برستی بارش کا راج تھا۔ رات کا اندھیرا گہرا ہو چکا تھا اور سجاوٹ کے لیے استعمال ہونے والے ڈھیروں سفید اور پیلے پھول اب لان کی مٹی اور ہری گھاس پر بکھرے، آسمان سے گرتے پانی میں بے رحمی سے بھیگ رہے تھے۔ پیلے اور سفید کپڑوں سے سجا وہ خوبصورت اسٹیج اب اداس اور سنسان کھڑا تھا جیسے کوئی گزرا ہوا جشن مٹی میں مل رہا ہو۔ باہر کا پورا ماحول اس طوفانی برسات کے باعث سحر انگیز حد تک بوجھل تھا۔ باہر جتنا طوفان تھا اندر اتنی ہی گہری اور مہیب خاموشی کا ڈیرا تھا جسے باہر برستی تیز بارش کی مسلسل گونجدار آواز مزید نمایاں کر رہی تھی۔ یہ نیمل کا پرسکون کمرہ تھا۔ مائیوں کا لباس اور میک اپ اب اس کے چہرے سے دھل چکا تھا اور وہ اس وقت ایک سادہ، ہلکے رنگ کے سوٹ میں ملبوس کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ تارہ اور نوفہ کی جیولری کو ایک ایک کر کے مخملی باکس میں واپس رکھ رہے تھے گویا وہ چند گھنٹوں کی رونق کو سمیٹ رہی ہو۔ اس کے سامنے میز پر لیپ ٹاپ کھلا ہوا تھا جس کی اسکرین پر اس وقت نجف کا چہرہ روشن تھا۔ نجف کی ہمیشہ کی طرح چمکتی ہوئی آنکھیں اسکرین کے پار سے بھی اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی تھیں۔

"میں نے تصویریں دیکھ لی ہیں نیمل تم بہت خوبصورت لگ رہی تھیں۔" نجف نے اسکرین پر نیمل کے دھلے چہرے کو دیکھتے ہوئے محبت سے کہا۔ "اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔"

"آپ کو آنا چاہیے تھا نجف خالہ! اگر آپ آجاتیں تو امی بہت خوش ہوتیں۔" نیمل نے ایک جھکا باکس میں رکھتے ہوئے قدرے شکوے سے کہا۔ نجف کے لبوں پر ایک انتہائی پھیکی اور اداس مسکراہٹ ابھری۔

"اگر میں آجاتی تو باقی سب دکھی ہو جاتے اور میں تمہارے گھر کے باقی افراد کو کوئی اذیت نہیں دینا چاہتی۔"

نیمل نے اپنے ہاتھ روک کر سر اٹھایا اور اسکرین پر نظر آنے والی نجف کو دیکھا۔ اس کے دل میں ایک بے نام سا شکوہ ابھرا۔ پچھلے دس طویل اور تاریک سالوں میں جہاں شبگیر خاندان کے حالات بالکل بدل گئے تھے جہاں سقراط دنیا کی نظروں سے بالکل غائب ہو چکا تھا وہاں اگر کسی ایک انسان نے ان سے محبت کا رشتہ قائم رکھا تھا تو وہ صرف نجف تھی۔ صرف وہی تھی جو ہر دکھ سکھ میں نیمل اور اس کی ماں کے ساتھ رابطے میں رہی۔

"آپ چاچو سے ملی ہیں نا؟" نیمل کے اچانک سوال نے فضا کے بوجھل پن کو یکسر بدل دیا۔ نجف کے چہرے پر یکدم گہرا سایہ سا لہرایا۔

"وہ ایک ایکسیڈنٹ تھا..."

نیمل نے ایک طویل اور گہرا سانس لیا۔ نجف کے اس ایک جملے نے جیسے اس کے ذہن کے کئی بند کواڑ کھول دیے تھے۔

"آپ شادی کیوں نہیں کر لیتی ہیں؟" نیمل نے نجف کی تنہائی اور اس کے عالیشان کمرے کے سناٹے کو محسوس کرتے ہوئے ہمدردی سے پوچھا۔

"مجھ سے شادی کون کرے گا؟" نجف نے ایک کھوئی ہوئی، ویران نظر سے کیمرے کی طرف دیکھا۔ "میرے دل کی دھڑکن کا کوئی بھروسہ نہیں۔ یہ کبھی بھی رک سکتی ہے، میں کبھی بھی مر سکتی ہوں۔"

"افف! نجف خالہ، ایسی باتیں نہ کریں۔" نیمل نے ایک جھرجھری لیتے ہوئے فوراً اسے ٹوکا۔ اس نے گھبرا کر اپنے کندھوں پر بکھرے ہوئے بالوں کو پیچھے جھٹکا۔ اسے ایسی باتیں سن کر ایک عجیب سے خوف کا احساس ہونے لگا تھا۔

"سچ ہی تو ہے۔" نجف ایک بار پھر پھیکا سا مسکرائی مگر اس مسکراہٹ میں موت کا سرد رنگ تھا۔ نیمل اب بہت غور سے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ رہی تھی۔

"آپ ٹھیک نہیں ہیں... ہے نا؟"

"اتنے بڑے بڑے حادثات کے بعد کوئی ٹھیک کیسے رہ سکتا ہے؟ زندگی نے ہمیں ٹھیک رہنے کا موقع کہاں دیا؟" نجف کی آواز میں دس سال کا نچوڑا ہوا زہر تھا۔

"زندگی میں آگے بڑھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ پلیز اب آگے بڑھیں۔ ماضی کی اس قید سے نکلیں اور اپنی زندگی جئیں۔" نیمل نے ایک مخلص دوست کی طرح اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ نجف نے ایک گہری اور بوجھل سانس لی۔ وہ اس حساس اور تکلیف دہ موضوع پر مزید کوئی بات کر کے اپنے اندر کے سوئے ہوئے طوفان کو بیدار نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"ٹھیک ہے، کافی رات ہوگئی ہے، نیمل...تم اب آرام کرو۔" نجف نے الوداعی لہجے میں کہا، وہ اب کال بند کرنا چاہتی تھی۔

"شادی پر ضرور آیئے گا ورنہ امی کا دل ٹوٹ جائے گا اور میں یہ بالکل نہیں دیکھ سکتی۔" نیمل نے حتمی انداز میں اپنی بات کہی۔ نجف جیسے ایک پل کے لیے بالکل ٹھہر سی گئی۔ ماضی کے کچھ چہرے اس کی آنکھوں کے سامنے لہرائے پھر اس نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا۔

"کوشش کروں گی...ٹیک کیئر!"

اور اگلے ہی پل اس نے کال ڈسکنیکٹ کر دی۔ نیمل کے سامنے کھلی لیپ ٹاپ کی اسکرین یکلخت تاریک ہوگئی۔ کمرے میں اب صرف باہر برستی طوفانی بارش کا شور گونج رہا تھا جو اب مزید تیز ہو چکا تھا۔ اس نے گہری سانس لی اور کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنے بالوں کو جوڑے میں سمیٹا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ اسے اب سقراط سے ملنا تھا۔ اوپری منزل پر ایستادہ وہ کشادہ کمرہ اس وقت باہر برستی طوفانی برسات کے سحر میں جکڑا ہوا تھا۔ بیڈ پر تکیوں سے ٹیک لگائے، اپنی لمبی ٹانگیں پھیلائے سقراط بیٹھا تھا۔ ایک پاؤں دوسرے کے اوپر دھرے وہ آرام دہ پوزیشن میں تھا جبکہ گود میں اس کا ذاتی لیپ ٹاپ رکھا تھا۔ اس وقت لیپ ٹاپ کی روشن اسکرین پر ایک ہنستی مسکراتی فیملی کی تصویر ڈسپلے ہو رہی تھی۔ ایک مرد، ایک عورت اور دو معصوم بچے۔ وہ کوئی اور نہیں بلکہ اقبال بزدار کی فیملی تھی۔ سقراط کی کاٹ دار نظریں اس تصویر پر جمی تھیں۔ وہ بزداروں کے شجرہ نسب کے ایک ایک مہرے کو اپنی بساط پر تول رہا تھا۔ اسی لمحے کمرے کے دروازے پر اچانک دھیمی اور نپی تلے انداز میں دستک ہوئی۔ سقراط کے ہاتھ کی بورڈ پر سیکنڈ کے سویں حصے میں چلے اور اس نے ایک ہی جھٹکے میں وہ خاندانی تصویر اسکرین سے ہٹا کر مکمل غائب کر دی۔ اس کا چہرہ پل بھر میں دوبارہ ایک عام اور لاتعلق سا ہو گیا۔

"آجاؤ..." اس کی بھاری آواز فضا میں گونجی۔ دروازہ کھلا اور نیمل اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک چھوٹی سی ٹرے پر ہلدی ملے گرم دودھ کا گلاس رکھا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی نیمل کی نظر کھڑکی کی جانب اٹھی۔ کمرے کی وہ بڑی شیشے کی ونڈو اس وقت پوری طرح کھلی ہوئی تھی اور اس کے آگے لٹکا ہوا گہرا پردہ تیز، طوفانی ہواؤں کے تھپیڑوں سے دیوانہ وار کمرے کے اندر اڑ رہا تھا۔ ہوا کے ان سرکش جھونکوں کے ساتھ بارش کی ٹھنڈی بوچھاڑ بھی مسلسل اندر آ کر فرش کے ایک حصے کو بھگو رہی تھی۔

"چاچو! باہر اتنی تیز بارش ہو رہی ہے اور آپ نے ونڈو بند نہیں کی؟" نیمل نے آگے بڑھ کر وہ ٹرے بیڈ پر رکھی اور لپک کر کھڑکی کے دونوں پٹ بند کرتے ہوئے ہینڈل گرا دیا۔ کمرے میں ہوا کا شور یکدم دھیما پڑ گیا۔

"اس معمولی ہوا سے سقراط شبگیر تو اڑنے سے رہا۔" سقراط نے لیپ ٹاپ پر نظریں جمائے سرد لہجے میں اپنی مخصوص کاٹ کے ساتھ کہا۔
نیمل نے مڑ کر سقراط کو دیکھا۔

"دودھ پی لیں ورنہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

"میں مریض ہوں جو روز مُجھے یہ ہلدی والا دودھ تھما دیتی ہو؟ اب تو میرے سارے پرانے زخم بھی بھر چکے ہیں۔" اس نے کی بورڈ پر انگلیاں پھیرتے ہوئے، خود کو حد درجہ مصروف ظاہر کرتے ہوئے روایتی اعتراض اٹھایا۔ نیمل نے اسکے سوال کو قدرے نظر انداز کیا۔

" آپ ایک ہاکی کوچ ہیں اور ایک کوچ کا رات کے اس پہر لیپ ٹاپ پر کیا کام؟" اس نے میز کے سامنے رکھی لکڑی کی آرام دہ کرسی گھسیٹی اور اس پر بیٹھ گئی۔
سقراط نے تعجب سے نیمل کو دیکھا اور پھر بنا کچھ کہے لیپ ٹاپ کا رخ گھما کر نیمل کی طرف کر دیا۔ اسکرین پر اب ایک بین الاقوامی ہاکی میچ کی پرانی اور تکنیکی ویڈیو چل رہی تھی جس میں کھلاڑیوں کی پوزیشنز کو گرافکس کے ذریعے سمجھایا جا رہا تھا۔ نیمل نے اسے دیکھ کر ایک گہرا اور مطمئن سانس لیا۔

" آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ آپ کا ایکسیڈنٹ نجف خالہ کی کار سے ہوا تھا؟"

نجف کا نام سماعت کے پردوں سے ٹکراتے ہی سقراط کے چہرے کے تاثرات یکلخت پتھرائے اور اس کے مضبوط جبڑے بری طرح بھنچ گئے۔

"یہ تو بزداروں کا روز کا کام ہے۔ ان کے لیے انسانی جانیں صرف ایک مہرہ ہیں۔"

" کیا مطلب؟" نیمل نے اپنی بھنویں سکیڑیں۔

"چولہے میں جائے مطلب!" سقراط نے اس حساس موضوع کو وہیں دفن کرنے کے لیے لیپ ٹاپ کو ایک طرف بیڈ پر رکھا اور آگے بڑھ کر ہلدی والے دودھ کا گلاس اٹھا لیا۔ اس نے گرم دودھ کا ایک گھونٹ لیا اور گلاس کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھامے انتہائی سنجیدگی سے نیمل کو

دیکھا۔

"میری بات اب غور سے سنو نیمل! تمہاری شادی ہونے جارہی ہے۔شاہ زیب ایک اچھا لڑکا ہے، میں جانتا ہوں۔لیکن...اگر زندگی کے کسی بھی موڑ پر، کسی بھی لمحے، اس نے تمہیں خوش نہ رکھا یا تمہیں وہاں کوئی بھی تکلیف پہنچی، کوئی بھی مسئلہ ہوا...تو تمہیں کسی سے ڈرنے یا اپنے دل میں چھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔تم بلا جھجک آ کر مُجھے بتاؤ گی! سمجھ گئی نا؟ اس کے بعد میری ہا کی جانے اور وہ شاہ زیب اور اس کا خاندان جانے!"

سقراط کا یہ جابرانہ مگر بے پناہ محبت سے بھرا دھمکی آمیز جملہ سن کر نیمل کے اداس چہرے پر ایک کھلکھلاتی ہوئی خوبصورت مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس کا سارا بوجھل پن ہوا میں اڑ گیا۔

"اوکے باس!" نیمل نے مسکراتے ہوئے اپنے سقراط کو ایک فرضی سلیوٹ کیا اور کرسی چھوڑ کر کھڑی ہوگئی۔

"بھابھی نے دواء کھالی تھی؟ اب کیسی طبیعت ہے ان کی؟" سقراط نے گلاس واپس رکھتے ہوئے پوچھا۔آخر وہ اسی طوفانی برسات میں اپنی زہرہ بیگم کی میڈیسن لینے ہی تو گیا تھا۔

"اب امی کی طبیعت کافی بہتر ہے۔" نیمل نے مڑ کر انتہائی نرمی سے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔تم انہیں وقت پر سونے کا کہہ دو اور خود بھی آرام کرو۔" اس نے تاکید کی۔

نیمل سر ہلا کر دھیمے قدموں سے اس کے کمرے سے باہر نکل آئی اور دروازہ بند ہوگیا۔اب اسے نیچے زہرہ بیگم کے کشادہ کمرے کی طرف جانا تھا جہاں مائیوں کی تقریب کے بعد رات کے اس پہر اس کے باقی تمام بہن بھائی جمع تھے۔کمرے کا ماحول جتنا پرسکون دکھ رہا تھا، زہرہ بیگم کا دل اندر سے اتنا ہی بوجھل تھا۔وہ برسوں سے دل کی مریضہ تھیں اور اب نیمل کی شادی کی گہما گہمی جہاں ان کے لیے خوشی کا باعث تھی وہاں کئی پوشیدہ پریشانیاں ان کے اعصاب کو توڑ رہی تھیں۔سب سے بڑا زخم ان کے اپنے مائیکے کی طرف سے ملا تھا۔نیمل کی شادی کا کارڈ بھیجنے کے باوجود، بزدار پیلس سے کسی ایک فرد نے فون تک کر کے خیر عافیت نہیں پوچھی تھی، مبارکباد دینا تو دور کی بات تھی۔ان کی بیٹی کی زندگی کا اتنا بڑا دن تھا اور باپ بھائیوں کی یہ سرد مہر خاموشی زہرہ بیگم کو اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹ رہی تھی۔وہ کسی سے کچھ کہتی نہیں

تھیں مگر یہی باتیں ان کے دل پر بوجھ بن کر بیٹھ گئی تھیں، جس کی وجہ سے آج ان کی طبعیت اچانک بگڑ گئی تھی اور ستم یہ کہ ان کی ضروری میڈیسن بھی کل شام سے ختم ہو چکی تھیں۔ شادی کے ہنگاموں میں انہوں نے دھیان ہی نہیں دیا۔ اس وقت ان کے بستر کے گرد نامرہ، نوفہ اور تارہ موجود تھیں۔ وہ زہرہ بیگم کو بہلانے اور ان کا دھیان بٹانے کے لیے ان کے گرد بیٹھی باتیں کر رہی تھیں کہ تبھی سلال کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے جیسے ہی کمرے میں قدم رکھا، اس کی نظر بستر پر نیم دراز نامرہ پر پڑی، جو اس وقت اس کی پسندیدہ اوورسائز ڈ شرٹ پہنے آرام سے بیٹھی تھی۔ سلال کے ماتھے پر فوراً بل پڑ گئے۔

"تم نے پھر میری شرٹ پہن لی؟"

"یہ شرٹ تمہاری کب تھی؟ یہ تو کب سے میرے پاس ہے بلکہ اب یہ میری ہی ہے۔" نامرہ نے انتہائی معصومیت سے جھوٹ بولتے ہوئے کالر درست کیے۔

"میں قسم سے کیس کر دوں گا۔" سلال نے انگلی اٹھا کر دھمکی دی۔

"ڈیفنس لائیر ہے میرے پاس!" نامرہ نے ناک سے مکھی آرائی جس پر تارہ اور نوفہ ہنس دیں۔

"کون کس پر کیس کر رہا ہے؟" نیمل اندر آئی۔

"میں کر رہا ہوں اس ٹیڑھے دانتوں والی پر..." سلال نے نامرہ کی طرف اشارہ کیا اور نیمل کی طرف مڑ کر بولا، "آپی پلیز جب اس کے رشتے والے گھر آئیں گے نا تو اسے کہنا ہنسے مت۔ ورنہ جیسے ہی یہ ہنسے گی اور انہوں نے اس کا یہ اوپر والا ٹیڑھا دانت دیکھا، وہ اسی وقت انکار کر کے بھاگ جائیں گے۔"

نامرہ کا اوپر کا ایک دانت ہلکا سا ٹیڑھا تھا جو سچ تو یہ تھا کہ ہنستے ہوئے اس کے چہرے پر بے حد جچتا اور معصوم لگتا تھا مگر سلال کو اسے چھیڑنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ چاہیے تھا۔

"تمہیں تو ویسے بھی کوئی رشتہ نہیں دینے والا..." نامرہ نے تپ کر جواب دیا۔ ان دونوں میں صرف ایک سال کا فرق تھا اور بچپن سے لے کر

اب تک ان کی یہ نوک جھوک گھر کی رونق تھی۔

"جس کی بہن ایسی انٹرنیشنل چور ہو اسے کوئی اپنی بیٹی کیوں دے گا بھلا؟" سلال نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اچھا بس بس، بہت ہو گیا تم دونوں کا! امی کے سامنے تو چپ کر جایا کرو۔" نیمل نے بیچ میں آ کر دونوں کو خاموش کروایا جبکہ زہرہ بیگم بستر سے ٹیک لگائے اپنے بچوں کی اس معصوم بحث کو دیکھ کر اپنے دل کا سارا دکھ بھول کر ہلکا سا مسکرا رہی تھیں۔

"اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" نیمل نے زہرہ بیگم سے پوچھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔" وہ نقاہت سے مسکرائیں۔

"آپی! آپ نے اپنے اسکول کے پرانے دوستوں کو شادی کا کارڈ بھیجا ہے؟" نوفہ کو فوراً یاد آیا۔ نیمل نے ایک گہرا سانس لیا اور نفی میں سر ہلا دیا۔

"میرا اسکول میں کوئی دوست بنا ہی نہیں نوفہ!"

"کیوں؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟" تارہ کو شدید حیرانی ہوئی۔

"ان محترمہ کی وجہ سے..." نیمل نے نامرہ کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ تارہ اور نوفہ نے بیک وقت حیرت سے نامرہ کو دیکھا جس کے چہرے پر فوراً خفت کے آثار ابھرنے لگے۔ سلال کو تو جیسے بہتی گنگا مل گئی۔ وہ فوراً سیدھا ہو کر بیٹھا۔

"ہاں! یہ چور محترمہ اسکول کے زمانے میں آپی سے اس حد تک آبسیڈ تھیں کہ اس نے آپی کے اردگرد کسی کو پھٹکنے ہی نہیں دیا۔ کہانی کچھ یوں ہے کہ آپی اس وقت آٹھویں کلاس میں تھیں، میں فورتھ میں یہ محترمہ تھرڈ کلاس میں۔ اور اس کا جنون یہ تھا کہ یہ آپی کو کسی اور لڑکی کے ساتھ کھڑے ہو کر بات کرتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔"

"واقعی؟"

نوفہ اور تارہ دلچسپی سے سننے لگیں جبکہ نامرہ نے تکیہ اپنے چہرے پر رکھنے کی ناکام کوشش کی۔

"اس کا ابسیشن لیول سنو! اگر کسی دن اسکول کے ہاف ٹائم میں آپی اپنی کسی کلاس فیلو کے ساتھ مصروف ہونے کی وجہ سے اسے اگنور کر دیتیں، تو یہ اسکول سے گھر آ کر بستر پر منہ دے کر روتی تھی کہ آج آپی نے گراؤنڈ میں مُجھے دیکھا ہی نہیں، انہوں نے مجھ سے بات کیوں نہیں کی۔ اور اگر آپی کسی دوسری لڑکی سے ہنس کر بات کر لیتیں تو یہ اس لڑکی کو دشمنِ جاں سمجھ لیتی تھی۔" سلال نے حظ اٹھاتے ہوئے انکشاف کیا۔ نیمل نے بھی بات آگے بڑھائی۔

"صرف یہی نہیں... یہ روز صبح میرا لنچ باکس چوری کر کے اپنے بیگ میں رکھ لیتی تھی تا کہ لنچ ٹائم میں مُجھے اس کے پاس آنا پڑے۔ میری استعمال شدہ پنسلیں اور ربڑ چوری کر کے اپنے پاس سنبھال کر رکھتی تھی جیسے کوئی خزانہ ہو۔"

نامرہ کا چہرہ سرخ پڑ چکا تھا۔ ان کی بچپن کی یادیں بہت خوبصورت تھیں۔ سب سے زیادہ ڈرامے باز نامرہ تھی۔

"پھر کیا ہوا؟" نوفہ کی دلچسپی برقرار رہی۔

"ایک بار آٹھویں کلاس میں آپی کی ایک بہت اچھی اور پکی فرینڈ بنی۔ اس فرینڈ شپ کو توڑنے کے لیے اس تھرڈ کلاس کی بچی نے رو رو کر امی کے سامنے جھوٹا ڈراما رچایا کہ آپی کی اس فرینڈ نے مُجھے واش روم کے قریب مارا ہے تا کہ آپی اس سے کٹی کر لیں۔" سلال نے گہری سانس لی۔ نیمل نے اس لڑکی سے دوستی سے ختم کر لی تھی کیونکہ نامرہ کو یہ پسند نہیں تھا۔

"پھر آپی کا ہائی سکول مکمل ہو گیا اور میری بربادی شروع..." سلال، نامرہ سے ایک کلاس آگے تھے۔ نیمل کے سکول سے جانے پر وہ کافی روئی لیکن پھر وہ سلال سے آبسیسڈ ہو گئی اور یہ آبسیشن نیمل سے کئی زیادہ تھی کیونکہ دونوں ایک ساتھ زیادہ وقت تک رہے۔

"اور سلال صاحب، محترمہ نامرہ شبگیر صاحبہ کے لیے لڑکیوں سے لڑنے جاتا تھا۔" نیمل نے اضافہ کیا تو اس بار سلال کے چہرے پر سرخی ابھری۔ نامرہ کی کسی لڑکی سے لڑائی ہو جاتی تو نامرہ لڑنے کے سلال کو بلا لیتی تھی۔ خود سائیڈ پہ بیٹھ جاتی اور سلال ہاتھ ہلا ہلا کر لڑکیوں سے

بحث کرتا۔

"تو میں اور کیا کرتا؟ یہ میری کلاس کے باہر فرش پہ بیٹھ جاتی تھی۔ایک بار اسکول کے سالانہ تقریری مقابلے میں، میں اسٹیج پر تقریر کر رہا تھا۔ یہ ہال کی پہلی رو میں بیٹھ کر مُجھے اس قدر شدت سے گھور کر دیکھ رہی تھی کہ میں اسٹیج پر اپنی لائنز بھول گیا اور حد تو یہ تھی کہ جیسے ہی میری تقریر ختم ہوئی، ابھی پرنسپل نے تالیاں بجانا شروع بھی نہیں کی تھیں کہ اس نے اکیلے کھڑے ہو کر پورے ہال میں اتنے زور زور سے تالیاں بجائیں اور نعرے لگائے کہ مُجھے اسٹیج پر شرمندگی ہونے لگی۔"

"اسٹاپ اٹ، سلال!" نامرہ نے لال پڑتے چہرے کے ساتھ تکیہ سلال کو دے مارا جو اس نے ہوا میں ہی کیچ کر لیا۔

" کیوں بھئی؟ اب اپنے تاریخی کارنامے سننے کا حوصلہ نہیں ہے؟" بچپن کے قصے یاد کرتے سلال کی آنکھوں میں نمی ابھری۔ وہ جب ہنستا تھا تو اس کی آنکھیں نم ہو جاتی تھیں۔ہنسی مذاق اور قہقہوں کا یہ طوفان جب آہستہ آہستہ تھما تو کمرے میں ایک بہت ہی نرم سی خاموشی چھا گئی۔ نیمل نے سب سے پہلے آگے بڑھ کر زہرہ بیگم کے گھٹنوں کے پاس جگہ بنائی اور ان کا ٹھنڈا ہاتھ اپنے دونوں گرم ہاتھوں میں تھام لیا۔

"امی...آپ ٹھیک ہیں نا؟"

نامرہ نے فوراً اپنی جگہ چھوڑی اور زہرہ بیگم کے برابر میں بیٹھ کر اپنا سر ان کے شانے پر رکھ دیا۔

"امی! آپ کیوں اتنی خاموش ہیں؟ آپ کو پتا ہے نا اگر آپ کی طبیعت ذرا سی بھی خراب ہو جائے تو ہم سب کا دل رک جاتا ہے۔"

سلال انتہائی سنجیدگی سے بستر کے پائینتی کی طرف جھکا اور ان کے پیروں کو آہستہ آہستہ دبانے لگا۔

"امی! اب آپ ایک بھی خوراک مس نہیں کریں گی۔ہمیں اپنی زہرہ بیگم بالکل فٹ اور تندرست چاہئیں!"

"ہاں امی! اب تو شادی کے فنکشنز باقاعدہ شروع ہو چکے ہیں۔" تارہ نے زہرہ بیگم کے دوسرے ہاتھ کو نرمی سے تھاما۔"مائیوں ہو گئی، اب مہندی اور بارات ہے۔اگر ہماری پیاری امی جان ہی اسپورٹس وومن کی طرح ایکٹو نہیں ہوں گی تو ہم سب مہندی پر ڈانس کیسے کریں گے؟

آپ کو ہمارے لیے جلدی سے بالکل ٹھیک ہونا ہوگا!"

جبکہ نوفہ بنا کچھ کہے ان سے لپٹ گئی تھی۔ زہرہ بیگم نے گہری سانس لی اور باری باری اپنے بچوں کے چہروں کو دیکھا۔ ان کے مائیکے نے انہیں جو زخم دیا تھا، ان کے بچوں کی اس بے پناہ خالص محبت نے اس پر مرہم رکھ دیا تھا۔ ان کی آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے مگر یہ آنسو دکھ کے نہیں بلکہ اس لازوال نعمت کے شکرانے کے تھے جو ان کے بچوں کی صورت میں ان کے پاس تھی۔

"میں ٹھیک ہوں۔ تم سب میرے پاس ہو تو مجھے کچھ نہیں ہو سکتا۔" زہرہ بیگم نے اپنے پانچوں بچوں کو بازوؤں کے گھیرے میں لے کر خود میں بھینچ لیا۔ باہر کی بارش اب بھی کھڑکی کے شیشوں پر سر پٹخ رہی تھی مگر شبگیر ہاؤس کے اس کمرے کے اندر ایک ماں اور اس کے بچوں کی محبت کا تپتا ہوا حصار قائم ہو چکا تھا۔

☆...☆...☆

رات کا پچھلا پہر تھا جب بزدار پیلس کے تمام دالان اور کوریڈورز ایک گہری خاموشی میں ڈوب چکے تھے۔ باہر برستی بارش اب ایک دھیمی سنسناہٹ میں بدل چکی تھی جو کھڑکیوں کے پار سنائی دے رہی تھی۔ سلویٰ نے، دھیمے قدموں سے چلتے ہوئے کامل کے کمرے کے دروازے کو آہستہ سے دھکیلا اور جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئی، سامنے کا منظر دیکھ کر اس کے قدم وہیں جم گئے اور وہ ششدر رہ گئی۔ بستر پر اس وقت ایسا خوبصورت منظر تھا جس کی توقع سلویٰ کو رات کے اس پہر بالکل نہیں تھی۔

ننھا کامل مکمل وارفتگی اور معصومیت کے ساتھ اپنے باپ سے لپٹا ہوا تھا، اس کا چھوٹا سا سر حق کے چوڑے سینے پر ٹکا ہوا تھا۔ دوسری طرف ہمیشہ کھنچا کھنچا، سنگِ مرمر کی طرح سخت اور اعصابی تناؤ کی گرفت میں رہنے والا حق بزدار اس وقت بالکل بدل چکا تھا۔ اس نے محبت سے کامل کو اپنے وجود کے ساتھ لگا رکھا تھا اور اس کا ایک بازو کسی ڈھال کی طرح بیٹے کے گرد حمائل تھا۔ وہ دونوں دنیا و مافیہا سے بے خبر حد درجہ پرسکون اور گہری نیند سو رہے تھے۔ سلویٰ ایک پل کو دروازے کے پاس ہی ٹھٹک کر رہ گئی۔ اس کی آنکھوں کے گوشے دھندلائے اور اس کے دل کے کسی نہاں خانے میں ایک عجیب سی ہلچل مچی۔ اسے ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں شدت سے یہ احساس ہوا کہ کائنات کی تمام تر تلخیوں، حق سے وابستہ تمام تر نفرتوں اور بزدار پیلس کے اس مہیب اندھیرے کے باوجود... اس کی دنیا یہیں مکمل تھی۔ اگر حق بزدار دنیا کے لیے بے رحم تھا تو اپنے بیٹے کے لیے وہ کائنات کا سب سے محفوظ سائبان تھا اور سلویٰ کی کائنات ان دونوں کے گرد ہی گھومتی تھی۔ اس منظر نے اس کے اندر جمی برف کو پگھلانا شروع کر دیا مگر اس سے پہلے کہ اس کا دل کوئی مستقل کروٹ لیتا، اس سے پہلے کہ اس کے جذبات اس کی سوچوں پر فتح پاتے، اس کے ہاتھ میں تھما ہوا موبائل فون اچانک تیز وائبریشن کے ساتھ بج اٹھا۔ اشعر کالنگ لکھا ہوا آ رہا تھا اور سلوی سر

جھٹکتی کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆...☆...☆

اگلی صبح رات کے طوفان کے بعد شبگیر ہاؤس کا منظر یکسر بدل چکا تھا۔ ہوا میں ایک بھینی بھینی، خوشگوار سی خنکی تھی مگر آسمان کا مطلع بالکل صاف اور شفاف تھا۔ سورج کی نرم سنہری دھوپ پورے صحن اور لان پر اس طرح بکھری تھی جیسے ہر چیز کو نئی زندگی مل گئی ہو۔ سلال صحن کے وسط میں کھڑا، کیٹرنگ والے لڑکوں سے مائیوں کا بچا کھچا بھاری سامان اور شامیانے اٹھوا رہا تھا بلکہ اب تقریباً سارا سامان باہر گاڑی میں لوڈ ہو چکا تھا۔ صرف صحن کی صفائی باقی تھی جو ملازمہ وائپر اور جھاڑو کی مدد سے تندہی سے کر رہی تھی تاکہ رات کی بارش کے اثرات کو مکمل صاف کیا جا سکے۔ دوسری طرف دھوپ سے چمکتے ہوئے ہرے بھرے لان میں دھری کرسیوں پر گھر کے باقی افراد بیٹھے تھے۔ پرسکون ماحول میں گرما گرم چائے اور ناشتے کی میز سجی تھی اور ناشتہ پوری رونق کے ساتھ جاری تھا۔ اسی دوران سرمد صاحب نے اردگرد نظریں بچا کر چپکے سے پلیٹ میں دھرے چمکدار رس گلے اور گلاب جامنوں کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا مگر ان کے برابر ہی بیٹھی تارہ کی عقابی نظروں نے یہ چوری پکڑ لی۔ اس نے فوراً سرمد صاحب کے ہاتھ پر ایک ہلکا سا تھپڑ مار کر انہیں روک دیا۔

"ابھی کل ہی آپ کا شوگر لیول ہائی تھا پاپا! میٹھے کو ہاتھ بھی نہیں لگانا۔" تارہ نے بنا کسی رعایت کے پلیٹ ان سے دور کرتے ہوئے کہا جس پر سرمد صاحب نے شکست خوردہ شکل بنا کر چائے کا مگ اٹھا لیا۔ ناشتے کی میز پر ایک کرسی اب بھی خالی تھی۔ نیمل نے چاروں طرف دیکھا اور چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے جیسے خود سے سوال کیا۔

"نامرہ ابھی تک سو رہی ہے کیا؟"

پھر اس نے کسی کے جواب کا انتظار کیے بغیر اپنے فون سے نامرہ کا نمبر ملا دیا مگر وہاں بیٹھے سب لوگ اچھی طرح جانتے تھے کہ نامرہ کو اپنے فون کی پرواہ کم ہی ہوتی تھی وہ چوبیس گھنٹے سائلنٹ پر رہتا تھا۔ اس کے نہ اٹھانے پر نیمل ایک آہ بھر کر کرسی سے اٹھی اور اسے خود جگانے کے لیے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئی۔ جب وہ نامرہ کے پرسکون نیم اندھیر کمرے میں داخل ہوئی تو نامرہ ہمیشہ کی طرح چادر تانے گہری نیند کے مزے لے رہی تھی۔ سائیڈ ٹیبل پر رکھا اس کا موبائل فون اس وقت نیمل کی ان کمنگ کال پر مسلسل وائبریٹ کر رہا تھا۔ نیمل نے آگے بڑھ کر جیسے ہی فون کی اسکرین پر نظر ڈالی وہ پل بھر کے لیے وہیں ساکت رہ گئی۔ اسکرین پر اس کا اپنا نمبر 'دوسری اماں' کے نام سے چمک رہا تھا۔ نیمل نے گہرا سانس لیا، نامرہ کی اس حرکت پر اسے شدید تپ چڑھی۔ پھر اس نے فون اٹھاتے ہوئے سوئی ہوئی نامرہ کا ہاتھ

کھینچ کر اس کا انگوٹھا فون کے فنگر پرنٹ سینسر پر لگایا اور لاک کھولا۔ پھر کانٹیکٹ لسٹ میں جا کر 'دوسری اماں' کا نام مٹایا اور اس کی جگہ 'ملکہ' لکھ کر سیو کر دیا۔ پھر فون واپس رکھ دیا۔

"اٹھ جاؤ، نامرہ! آج ہمیں سیلون بھی جانا ہے بہت دیر ہو رہی ہے۔" نیمل نے اس کے کندھے کو ہلایا اور چادر کھینچی۔

سیلون کا نام سماعت سے ٹکرانا تھا کہ نامرہ جو کسی بھی دھمکی سے نہیں اٹھتی تھی کسمسا کر آنکھیں کھولیں۔

"تو کیا میں اس بار ایک نیا اور ماڈرن ہیئر کٹ لے سکتی ہوں؟" اس نے نیند سے بوجھل آنکھیں لیے پوچھا۔ لیٹے لیٹے ہی انگڑائی لی۔

"یہ تم امی سے پوچھنا..." وہ اسے جلدی باہر آنے کی تنبیہ کرتے واپس چلی گئی۔ باہر لان کا ماحول اب دھیما اور سنجیدہ ہو چکا تھا۔ نوفہ ناشتے سے فارغ ہو کر دادی کی کرسی کے بالکل قریب کرسی کیے بیٹھی تھی۔

"دادی... ہمیں برا کون بناتا ہے؟ ہمارے اپنے لوگ یا یہ باہر کی سوسائٹی؟ آپ نے وہ مشہور انگریزی جملہ تو سنا ہی ہوگا کہ Villains are made, not born (ولن پیدا نہیں ہوتے، بنائے جاتے ہیں)۔"

اس نے ایک اور نئی کتاب پڑھی تھی اور اسکا ذہن متضاد نظریات پر الجھ کر رہ چکا تھا۔

"دنیا اور یہ سوسائٹی تو بہت بعد میں آتی ہے۔ سب سے پہلے ہمارا پالا ہمارے اپنے گھر میں، ہمارے اپنے خون سے پڑتا ہے۔ ہماری ذہن سازی، ہماری سوچ کی بنیاد ہمارے اپنے کرتے ہیں۔ ہمارے ساتھ سب سے پہلی ناانصافی اکثر ہمارے اپنے ہی کرتے ہیں۔ انسان کو زندگی کا پہلا، سب سے گہرا اور جان لیوا زخم ہمیشہ اپنوں سے ہی ملتا ہے۔ باہر کی دنیا کا کیا ہے؟ دنیا تو کبھی کسی کی ہوئی ہی نہیں، اس کے دیے زخم تو انسان وقت کے ساتھ بھول جاتا ہے مگر اپنوں کی دی ہوئی اذیت روح کا حصہ بن جاتی ہے۔"

دادی نے نوفہ کا جواب تفصیل سے دیتے ہوئے گہری سانس لی۔ انکا ذہن کہیں دور سرحد پار جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"بالکل ٹھیک کہا آپ نے اماں! انسان کبھی بھی غیروں کی وجہ سے تلخ یا بے رحم نہیں بنتا۔ غیر تو صرف سطح پر کھرچ سکتے ہیں۔ یہ تو ان لوگوں کی

بے وفائی اور سازشیں ہوتی ہیں جن کا نام ہم اپنے نام کے ساتھ لگاتے ہیں جو ایک ہنستے کھیلتے انسان کو پتھر میں بدل دیتی ہیں۔ جب اپنے ہی گھر کی حفاظتی دیواریں انسان کا دم گھونٹنے لگیں تو اندر کا انسان مر جاتا ہے اور وہاں ایک ایسا وجود جنم لیتا ہے جسے دنیا مونسٹر کہتی ہے۔"

سرمد صاحب نے بھی اپنی آرا پیش کی۔

"اور جب وہ اندر کا انسان مرتا ہے نا نوفہ تو دنیا صرف اس کے بدلے ہوئے روپ کو دیکھتی ہے۔"

سلال بھی کیٹرنگ والوں کو فارغ کر کے اسی طرف آ گیا۔ وہ کرسی کھینچ کر نوفہ کے ساتھ بیٹھا۔

"میں ولنز پہ یقین نہیں رکھتا..." اس نے مختصر بات کی۔ "انسان اچھا اور برا دونوں ہوتا ہے۔ اگر دنیا کی بے رخی سے صرف ولنز ہی پیدا ہوتے تو ہماری اسلامی تاریخ میں سارے ہی ولنز ہوتے۔ وہاں دنیا اور اپنوں نے کیا کچھ نہیں کیا؟ پھر یہ اتنے ہیرو کہاں سے آ گئے؟"

نوفہ نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ مزید الجھ گئی جبکہ دادی نے مسکرا کر سلال کی فہم کو سراہا۔

"دنیا کا اثر ہمارے behaviour پر ضرور ہوتا ہے۔" سلال نے بات جاری رکھی۔ "دنیا ہمیں تلخ کرتی ہے۔ محتاط کرتی ہے۔ ہمارا لہجہ بدل دیتی ہے۔ مگر حقیقی زندگی میں بدلہ لینا اتنا عام نہیں ہوتا۔ کوئی کسی کو جان سے یوں ہی نہیں مار دیتا۔ لوگ جیتے ہیں، صبر کرتے ہیں اور آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ایسے ولنز والے انتہا پسند کیس تو آٹے میں نمک کے برابر ہوتے ہیں۔"

وہ چائے کی چسکی لیتے ہوئے بولا۔

"زندگی فلم نہیں ہے۔ حقیقت میں انسان صدمے پی کر بھی جیتا ہے۔" نیمل ہولے سے مسکرائی تو نوفہ نے بس سر ہلایا۔ زہرہ بیگم اب باتوں کا رخ موڑ چکی تھیں مگر نوفہ؟ اس کی الجھن آخر کون دور کرتا؟

☆...☆...☆

بزدار میڈیکل کالج کا ماحول آج معمول سے ہٹ کر پرسکون تھا۔ بارش کے بعد کی ٹھنڈی ہوا اب بھی راہداریوں میں گھوم رہی تھی۔ سلال چار دنوں کے لیے چھٹی پر تھا، اور یہ پہلی بار ہوا تھا جب اس نے چار دن کی چھٹی لی تھی وہ بھی نیمل کی شادی کے لیے۔ یہ فری وقت تھا۔ کالج کے کشادہ کیفے ٹیریا کے ایک کونے میں عالیہ اور زنیرہ بیٹھی تھیں۔ میز پر گرما گرم چائے کے دو مگ رکھے تھے جن سے ہلکا ہلکا دھواں اٹھ رہا تھا۔

"آج سلال نہیں آیا... تمہیں کتنا ریلیکس محسوس ہو رہا ہوگا نا؟" زنیرہ نے چائے کا مگ اٹھاتے ہوئے گہری نظروں سے عالیہ کو دیکھا۔ عالیہ پل بھر کے لیے تذبذب کا شکار نظر آئی۔ اس کے لب سلے رہے، وہ کچھ نہ بولی۔ اس کی خاموشی میں ایک بے نام سی الجھن تھی۔ اس نے بس سر ہلایا۔

"ویسے عالیہ! تمہارے خاندان کی سلال کے خاندان سے کوئی پرانی دشمنی ہے کیا؟ میرا مطلب ہے، کوئی خاندانی مسئلہ؟" زنیرہ نے چائے کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے بالآخر وہ سوال پوچھ ہی لیا جو وہ کئی دنوں سے پوچھنا چاہتی تھی۔

"ارے نہیں... بالکل نہیں۔" عالیہ نے فوراً نفی میں سر ہلایا مگر پھر ایک گہری سانس لے کر میز پر جھک گئی۔ "دشمنی نہیں ہے... کہانی کچھ اور ہے۔"

"اگر دشمنی نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟"

"نفرت ہے، ناراضی ہے۔"

"شروع سے بتاؤ!" زنیرہ سیدھی ہو بیٹھی۔

"دراصل یہ کہانی ہمارے بڑے تایا سے شروع ہوتی ہے۔" عالیہ نے ماضی کی بساط کھولنا شروع کی۔ "امام تایا (حق بزدار کے والد) اپنے کالج کے دنوں میں آصفہ سکندر سے ملے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے اور پھر انہوں نے پسند کی شادی کر لی۔ شروع میں سب کچھ بہت اچھا اور مثالی تھا۔"

زنیرہ دلچسپی سے سننے لگی۔

"پھر شادی کے چند سالوں بعد، تائی آصفہ اپنے ایک کزن سرمد شبگیر کا رشتہ بڑی پھوپھو یعنی زہرہ پھوپھو کے لیے لے آئیں۔ سرمد صاحب کوئی بہت امیر تو نہیں تھے مگر خاندان اچھا تھا۔ ان کی ایک چھوٹی سی فیکٹری تھی۔ زہرہ پھوپھو کو کوئی اعتراض نہیں تھا اور یوں ان دونوں کی شادی ہوگئی۔ زندگی سب کے لیے بہت حسین اور پرسکون تھی۔"

"پھر کیا ہوا؟" زنیرہ نے فوراً پوچھا۔

"پھر پتا نہیں کیوں آہستہ آہستہ بڑے تایا اور تائی آصفہ میں شدید جھگڑے شروع ہوگئے۔ ان کی آپس میں بگڑنے لگی۔ حالات اس حد تک خراب ہوگئے کہ تائی نے بڑے تایا سے خلع کا مطالبہ کر دیا مگر تایا اپنی انا کی وجہ سے نہیں مانے۔ بات بڑھتی گئی۔ اور پھر...ایک رات...تائی آصفہ نے تنگ آ کر خود بڑے تایا کا قتل کر دیا۔"

"او مائی گاڈ!" زنیرہ کے ہاتھ سے چائے کا مگ چھوٹتے چھوٹتے بچا۔ "تمہارے خاندان میں یہ سب بھی ہوا ہے؟"

"ہاں...مام بتاتی ہیں۔" عالیہ کا لہجہ بوجھل ہوگیا۔ "اس کے بعد سارے رشتے تاش کے پتوں کی طرح بکھر گئے۔ تائی آصفہ جیل چلی گئیں۔ ہمارے داجی (دادا) نے زہرہ پھوپھو سے صاف کہہ دیا کہ وہ شبگیر خاندان سے سارے رشتے توڑ دیں اور اپنے شوہر سرمد سے طلاق لے لیں مگر پھوپھو نے صاف انکار کر دیا۔"

"انکار کر دیا؟"

"ہاں کیونکہ ان کے بچے اس وقت بہت چھوٹے تھے۔ وہ اپنے گھر میں خوش تھیں اور اپنے شوہر اور بچوں کو کسی قیمت پر نہیں چھوڑنا چاہتی تھیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پھوپھو نے اپنے شوہر کو نہیں چھوڑا اور داجی نے زہرہ پھوپھو کو چھوڑ دیا۔ ہمارے خاندان نے ان سے سارے رشتے ختم کر لیے۔"

"تو پھر یہ سلال کے چاچو اور تمہاری دوسری پھوپھو والا سین کب ہوا؟" زنیرہ نے بے تابی سے اگلا سوال داغا۔

"یہ آج سے کوئی بارہ سال پہلے کی بات ہے۔" عالیہ نے چائے کےمگ کو اپنے ہاتھوں کے گھیرے میں لیا۔ "سلال کے چاچو (سقراط شبگیر) اورحق بھائی کی کہیں ملاقات ہوئی اور دونوں میں گہری دوستی ہوگئی۔حق بھائی کے ذریعے ہی سلال کے چاچو کی ملاقات نشاط اور نجف پھوپھو سے ہوئی۔تب تک حق بھائی کی امی (تائی آصفہ) اپنے اچھے برتاؤ کی وجہ سے جیل سے رہا ہونے والی تھیں اور سلال کے چاچو چاہتے تھے کہ حق بھائی اپنی امی سے ملیں۔ان سے ناراضی ختم کردیں اور داجی زہرہ پھوپھو سے ناراضی ختم کردیں۔ان کی دوستی اتنی گہری ہوگئی تھی کہ ٹوٹے ہوئے خاندانی رشتے پھر سے جڑنے لگے۔دونوں گھرانوں کا آنا جانا شروع ہوگیا۔"

"پھر؟" زنیرہ کے چہرے پر تجسس گہرا ہوگیا۔

"اور پھر سلال کے چاچو اور نجف پھوپھو ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے۔کافی کوششوں کے بعد ان کا رشتہ طے ہوا ہی تھا کہ سلال کے چاچو کی نیت خراب ہوگئی۔انہوں نے نشاط پھوپھو پر ریپ اٹیک کردیا۔"

"افف خدایا!" زنیرہ نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔" کیسا عجیب خاندان ہے سلال کا...ایک قاتل اور ایک ریپسٹ..."

عالیہ کے لبوں پر انتہائی پھیکی بے رنگ سی مسکراہٹ ابھری۔

"بس پھر سب کچھ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا۔سلال کے چاچو جیل چلے گئے۔نشاط پھوپھو نے اس صدمے میں اپنی میڈیکل کی پڑھائی ادھوری چھوڑ دی جبکہ نجف پھوپھو جرمنی چلی گئیں۔اس ہولناک حادثے کو اب دس سال ہو چکے ہیں۔لیکن تم زہرہ پھوپھو کو دیکھو انہوں نے اس سب کے باوجود اپنے گھر، اپنے شوہر کو نہیں چھوڑا حالانکہ ان کے اپنے دیور نے ان کی بہن پر اتنا بڑا حملہ کیا تھا۔"

"مُجھے تو یہ سب سن کر ہی ڈپریشن ہو رہا ہے۔" زنیرہ نے اپنا سر جھٹکا۔

عالیہ نے بس ہلکا سا ہوں کیا اور اپنی نظریں کیفے کی بڑی شیشے کی کھڑکی سے باہر، کالج کے وسیع لان کی طرف ٹکائیں۔اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔باہر دیکھتے ہوئے اس کے ذہن کے بند گوشوں میں اچانک نشاط کے وہ سرد الفاظ بار بار گونجنے لگے۔

"وہی کرو جو دس سال پہلے ہوا تھا..."

ان الفاظ کی گونج اتنی تیز تھی کہ عالیہ کا دل اندر سے کپکپا اٹھا۔اس نے فوراً اپنا سر جھٹکا اور اپنے بالوں کو پیچھے کرتے ہوئے ان خوفناک آوازوں کو اپنے ذہن سے نکالنے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔رتق کی بساط پر ماضی کے زخم اب بھی ہرے تھے اور حال کا طوفان دستک دے رہا تھا۔

☆...☆...☆

سڑک پر اس وقت ایک عالیشان گاڑی متناسب رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔اس گاڑی کے آگے پیچھے سیکورٹی کی دو گاڑیاں تھیں۔گاڑی کے اندر کا ماحول حد درجہ پرسکون تھا۔پچھلی کشادہ نشست پر امجد بزدار اپنی سحر انگیز شخصیت کے ساتھ براجمان تھے۔ان کے بالکل برابر میں اقبال بیٹھا تھا۔

"تو کیا اپڈیٹ ہے؟" امجد صاحب نے سامنے دیکھتے ہوئے اپنی رعب دار آواز میں پوچھا۔

"حق آج بھی حازق کے لیے پاگل ہے داجی!" اقبال نے رخ ان کی طرف موڑتے ہوئے جواب دیا۔"اس کا نام سنتے ہی وہ ذہنی طور پر کمزور پڑ جاتا ہے۔وہ اپنی پوزیشن بھول جاتا ہے۔حازق کا خوف آج بھی اس کے اعصاب پر سوار ہے۔"

امجد صاحب کی تیکھی ابرو ہلکی سی اٹھی، " کیا وہ اپنی باقاعدہ دوا نہیں لے رہا؟"

"لے رہا ہے مگر حازق..." اقبال نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔وہ حق کی ذہنی حالت کی سنگینی کو الفاظ دینے سے قاصر تھا۔

"ہوں..." امجد صاحب نے گہرا ہنکارہ بھرا۔ان کے چہرے پر یکدم تفکر اور تشویش کے گہرے سائے ابھرے۔حق بزدار کا ذرا سا بھی کمزور پڑنا ان کی بساط کے لیے اچھا شگون نہیں تھا۔اس سے پہلے کہ وہ اس موضوع پر مزید کوئی بات کرتے امجد صاحب کا موبائل فون اچانک سے ساتھ بج اٹھا۔سامنے والی سیٹ کی پشت سے منسلک پچھلی میز پر وہ فون رکھا ہوا تھا۔انہوں نے ہاتھ بڑھا کر فون اٹھایا۔اسکرین پر چمکتے ہوئے ایک نامعلوم نمبر کو دیکھ کر ان کے ماتھے پر گہرے بل پڑ گئے۔پھر کچھ سوچتے ہوئے انہوں نے کال رسیو کر کے فون کان سے لگایا۔

"ہیلو؟" ان کا لہجہ نپا تلا تھا۔

"امجد بزدار صاحب! لگتا ہے آپ کو اپنی ریپوٹیشن اب عزیز نہیں رہی جو مُجھے دوسری بار فون کرنا پڑ رہا ہے۔" دوسری طرف سے ایک طنزیہ آواز ابھری۔ "ذرا سوچیے ...اگر میں نے آپ کا وہ اکتیس سالوں سے دبا ہوا راز، وہ پرانی قبر کھول دی...تو کیا ہوگا؟ آپ کے اس پورے بزدار امپائر کا کیا بنے گا؟"

یہ کوئی پہلی کال نہیں تھی۔ امجد بزدار نے پورے تحمل سے اس بلیک میلر کی پوری بات سنی۔ ان کے چہرے پر پل بھر کے لیے ایک مہیب سی سختی آئی مگر اگلے ہی سیکنڈ میں ان کے تاثرات ایک منجھے ہوئے شاطر کھلاڑی کی طرح بدل گئے۔

"منہ بند کرنے کا کیا لو گے؟" انہوں نے حد درجہ سپاٹ اور کاروباری لہجے میں پوچھا۔ دوسری طرف سے ایک کرخت اور کامیاب سا قہقہہ سنائی دیا۔

"یہ ہوئی نا بزداروں والی کام کی بات! آج رات ٹھیک دس بجے۔ میں آپ کو باقی تفصیلات اور لوکیشن میسج کر رہا ہوں۔"

اگلے ہی پل لائن ڈسکنیکٹ ہوگئی۔ کال کٹ چکی تھی۔ امجد صاحب نے فون کان سے ہٹایا اور چند سیکنڈز تک اس سیاہ اسکرین کو گھورتے رہے۔ ابھی کچھ منٹ ہی گزرے تھے کہ فون پر ایک ہلکی سی ٹون گونجی۔ اس نامعلوم شخص نے اپنی ڈیمانڈ اور لوکیشن بھیج دی تھی۔ بنا میسج دیکھے انہوں نے اپنے ہاتھ میں تھما وہ فون سیدھا اقبال کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ شخص آج رات ہر قیمت پر چاہیے۔" امجد صاحب کی آواز میں موت جیسی سردی تھی۔ اقبال نے مستعدی سے فون پکڑا۔ اس نے اسکرین پر موجود لوکیشن اور بلیک میلر کی تمام تفصیلات کو غور سے دیکھا۔ پھر اس نے امجد صاحب کی طرف دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا۔ رولز رائس اب بھی اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی مگر گاڑی کے اندر اکتیس سال پرانے ایک ایسے طوفان کا سراغ مل چکا تھا جسے بزدار خاندان آج رات ہمیشہ کے لیے مٹی میں دفن کرنے والا تھا۔

☆...☆...☆

صبح کے اس پہر اپنی چاک و چوبند شخصیت کے ساتھ ڈاکٹر حق راؤنڈ پر تھا۔اس کے ہاتھ میں مریضوں کی ہسٹری شیٹس تھیں۔اس کے پیچھے دو جونیئر ڈاکٹرز اور نرسز کا عملہ ہاتھ باندھے انتہائی مستعدی سے چل رہا تھا۔وہ ایک آئی سی یو وارڈ کے باہر رکا اور پلٹ کر نرس کو دیکھا۔

"بیڈ نمبر چار کے مریض کا بلڈ پریشر ہر آدھے گھنٹے بعد مانیٹر ہونا چاہیے اور ان کی آئی وی لائن کی ڈوز میں نے جو لکھ کر دی ہے،اس میں ایک پوائنٹ کا بھی ہیر پھیر نہیں ہونا چاہیے۔اگر کوئی بھی ایمرجنسی ہو تو مجھے فوراً رپورٹ کریں۔"

نرس نے سر ہلایا اور ہدایات نوٹ کرنے لگی۔

وارڈ کا راؤنڈ مکمل کرنے کے بعد حق کے موبائل فون پر ایک بیل گونجی۔وہ کال سننے کے لیے ہاسپٹل کی اندرونی راہداری سے نکل کر باہر کھلے احاطے کی طرف آ گیا جہاں ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور ہاسپٹل کا باغیچہ نظر آ رہا تھا۔ابھی اس نے فون کان سے لگایا ہی تھا کہ باغیچے کے ایک کونے میں لگی بنچ کے پاس اس کی نظریں ایک منظر پر جا کر ٹھہر گئیں۔وہاں ڈاکٹر یاور کھڑے تھے اور اس وقت ایک نوجوان جونیئر نرس کے بالکل قریب کھڑے ہو کر حد درجہ محوِ گفتگو تھے۔فاصلہ ہونے کی وجہ سے حق ان کی آواز تو نہیں سن سکتا تھا مگر وہ دور سے ان کے باڈی لینگویج کو صاف پڑھ سکتا تھا۔ڈاکٹر یاور کا جھکاؤ اس نرس کی طرف ضرورت سے زیادہ تھا جبکہ وہ نرس شدید غیر آرام محسوس کر رہی تھی۔وہ بار بار اپنے قدم پیچھے ہٹانے کی کوشش کر رہی تھی،اس کا چہرہ خوف اور گھبراہٹ سے زرد پڑ رہا تھا جبکہ ڈاکٹر یاور کے چہرے پر خود اعتمادی سے بھری مسکراہٹ تھی۔یہ دیکھتے ہی حق کے جبڑے بے طرح بھنچ گئے۔اس کی آنکھوں میں ایک سفاکیت ابھری۔اس نے فون جیب میں ڈالا اور تیز قدموں سے اندر کی طرف مڑ گیا۔کچھ دیر بعد وہ نرس ہاسپٹل کے اندرونی دالان سے گزر رہی تھی۔

"ایکسکیوزمی!"

ڈاکٹر حق بزدار کو خود سے مخاطب ہوتے دیکھ کر وہ نرس پل بھر کو سہم گئی۔

"مُجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔" حق نے نپے تلے لہجے میں کہا۔نرس خود پر قابو پوتے ہوئے اس کی جانب متوجہ ہو گئی۔

"یس ڈاکٹر حق!"

" کیا ہم میرے آفس میں چل کر بات کر سکتے ہیں؟"اس نے اپنے عقب میں موجود آفس کی طرف اشارہ کیا۔نرس کے چہرے پر مزید گھبراہٹ ابھری۔وہ ایک کم عمر لڑکی تھی اور یقیناً نئی آئی تھی۔اس کی وردی،اسکا دوپٹہ اور گلے میں لٹکتا کارڈ بتا رہا تھا وہ اپنے پیشے سے کس قدر مخلص تھی۔اس سے پہلے نرس کچھ جواب دیتی...حق کو اپنی اسسٹنٹ جویریہ نظر آ گئی جو فائل ہاتھ میں تھامے اسی جانب آ رہی تھی۔

"جویریہ...انہیں میرے روم میں لے کر آئیں۔"وہ حکمیہ انداز میں کہتا پلٹ گیا۔جویریہ کو دیکھ کو نرس نے سکون کا سانس لیا اور پھر اس کے ساتھ نپے تلے قدم اٹھاتی حق کے آفس کی جانب بڑھ گئی۔چند لمحوں کے بعد وہ نرس اور حق دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔جویریہ نرس کے عقب میں کھڑی تھی۔حق نے دوبارہ اس کے کارڈ پر نظر دوڑائی۔جہاں اسکا نام اور پوزیشن لکھی ہوئی تھی۔

"عظمی کیسی ہیں آپ؟"

"جج...میں ٹھیک ہوں۔"وہ بمشکل مسکرائی۔

"ویری گڈ..."وہ کرسی سے پشت ٹکائے بیٹھا تھا۔کرسی دائیں بائیں کو ہلکی سی جھول تھی جبکہ اس کے چہرے پر جانچتے ہوئے سے تاثرات تھے۔

"میں آپ سے کچھ پوچھنے جا رہا ہوں۔مُجھے امید ہے آپ سچ بولیں گی۔"عظمی نے بس سر ہلا دیا۔

"ابھی باہر لان میں ڈاکٹر یاور آپ سے کیا کہہ رہے تھے؟"حق نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔اس کی آواز میں ایک حاکمانہ دباؤ تھا جو جھوٹ کی گنجائش نہیں چھوڑتا تھا۔

"وہ...ڈاکٹر یاور...وہ اکثر مجھ سے اور دوسری جونیئر نرسز سے اشاروں اشاروں میں بہت عجیب باتیں کر جاتے ہیں۔ڈھکے چھپے الفاظ کا استعمال کر کے فلرٹ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔کچھ غلط نہیں بولتے ہیں لیکن ان کا انداز ایسا ہوتا ہے کہ بہت ان کمفرٹیبل محسوس ہوتا ہے۔پہلے ان کا یہ رویہ کم تھا لیکن پچھلے کچھ دنوں سے ان کی ہمت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔"

"آپ نے کمپلین کیوں نہیں کی؟" حق کی بھنویں سکڑ گئیں۔ عظمی نے تھوک نگلا۔

"وہ ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ وہ بس دیکھ کر ایسی بات کر جاتے ہیں...اور..." وہ ابھی اس فیلڈ میں نئی آئی تھی اس لیے خوفزدہ تھی۔ ابھی اسے اپنا 'حق' استعمال کرنے کا پتا ہی نہیں تھا۔ اسکے عقب میں کھڑی جویریہ، پورے آفس میں ٹھنڈک اترتی محسوس کر رہی تھی۔ حق کی آنکھیں...وہ سرد پڑ چکی تھیں۔

"ٹھیک ہے، آپ جا سکتی ہیں اور یاد رکھیں...آئندہ کوئی ڈاکٹر یا وارڈ بوائے کسی بھی لڑکی سے کسی بھی قسم کی بدتمیزی کرے تو آپ خود آ کر مُجھے بتائیں گی ورنہ ان کی جگہ آپ کو ہسپتال سے نکالا جائے گا۔ سمجھ گئی ہیں؟"

"یس ڈاکٹر..." عظمی نے سر ہلایا تو حق نے اسے جانے کا کہا۔ اس کے جانے کے بعد جویریہ نے حق کو دیکھا جس کی بند مٹھی میز پر ٹکی تھی۔ وہ گہری سانس لے کر خود پر ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اب کیا کرنا ہے؟"

"مُجھے ڈاکٹر یاور کا پورا ریکارڈ چاہیے ابھی..."

یہ سنتے ہی جویریہ کے چہرے پر چمک سی ابھری اور وہ پرجوش سی کمرے سے باہر نکل گئی۔ یہ تو اسکا پسندیدہ کام تھا۔

☆...☆...☆

شہر کے ایک مضافاتی علاقے میں واقع وہ پرتعیش اور مہنگا پرائیویٹ کلب صرف خواتین کے لیے مخصوص تھا۔ کلب کا اندرونی حصہ جدید آرکیٹیکچر کا نمونہ تھا۔ فیروزی رنگ کے وسیع سوئمنگ پول کا شفاف پانی ہلکی لہروں کے ساتھ چمک رہا تھا اور چاروں طرف انڈور پلانٹس اور سفید سنگِ مرمر کے ستون اس جگہ کو ایک شاہانہ اور پرسکون ماحول دے رہے تھے۔ سلویٰ اس وقت پول کے گہرے پانی میں موجود تھی۔ پانی اس کے کندھوں تک آ رہا تھا اور اس کے تر بال اس کی پیٹھ پر پھیلے ہوئے تھے۔ اس کے بالکل برابر میں اس کی سب سے خاص اور قابلِ اعتماد دوست مرینہ کھڑی تھی جو پانی کی لہروں کو اپنے ہاتھوں سے پیچھے دھکیل رہی تھی۔ دونوں کے درمیان سنجیدہ اور خفیہ موضوع پر گفتگو جاری

تھی۔

"میں اب مزید اس گھٹن میں نہیں رہ سکتی..." سلویٰ نے اپنے چہرے پر لگی پانی کی بوندوں کو ہاتھ سے صاف کرتے ہوئے نہایت بوجھل لہجے میں کہا۔ "میں حق سے خلع چاہتی ہوں، میں نے کئی بار اس سے بات کی ہے مگر وہ سنجیدہ نہیں ہے۔ وہ کسی قیمت پر طلاق دینے کو تیار نہیں ہے۔"

مرینہ نے فکرمندی سے سلویٰ کے خوبصورت چہرے کو دیکھا۔

"تم جو فیصلہ کرنے جارہی ہو، اس سے پہلے کامل کے بارے میں تو سوچو۔ وہ ایک سپیشل چائلڈ ہے، ایسے بچوں کو ماں اور باپ دونوں کے مستقل سائے کی ضرورت ہوتی ہے۔"

مرینہ کی بات سن کر سلویٰ کے لبوں پر تلخ اور سرد سی مسکراہٹ ابھری۔ اس نے گہرا سانس لیا، جیسے وہ اپنے اندر کا کوئی بہت بڑا غبار باہر نکال رہی ہو۔

"حقیقت تو یہ ہے کہ پریگننسی کے دوران جب مُجھے اس کی اس بیماری کا پتا چلا تھا تو میں اسے اس دنیا میں لانا ہی نہیں چاہتی تھی مگر یہ صرف اور صرف حق کی ضد تھی کہ اسے یہ بچہ ہر قیمت پر چاہیے۔ وہ اپنے بھائی کے متبادل کے طور پر کامل کو دیکھ رہا تھا۔

سلویٰ کی آواز میں ایک پرانا کرب ابھرا۔ وہ ایک پل کو رکی، پھر نرمی سے بولی۔

"یہ سچ ہے کہ کامل مُجھے بھی اتنا ہی پیارا ہے، آخر وہ میرا خون ہے، میری جان بستی ہے اس میں مگر مرینہ... میں صرف ان دونوں کے لیے اپنی پوری زندگی کیسے برباد کرلوں؟ میری اپنی بھی تو کوئی خواہشات ہیں، میری بھی تو کوئی زندگی ہے!"

"لیکن حق نے تم سے کہا تو ہے کہ وہ ماضی کی تلخیوں کو بھلا کر تمہارے ساتھ دوبارہ ایک نئی اور خوبصورت شروعات کرنا چاہتا ہے۔" مرینہ نے اسے قائل کرنے والے انداز میں سمجھایا۔ "اسے صرف ایک موقع دے کر دیکھ لو، شاید وہ اب بدل جائے، شاید وہ ٹھیک ہو جائے۔"

"میں اشعر سے محبت کرنے لگی ہوں مرینہ!" سلویٰ نے بنا کسی جھجک یا خوف کے وہ سچ اگل دیا جس نے ان کے رشتے کی بنیادیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔ "میرا دل اب حق کے پاس نہیں ہے۔ میں اب حق بزدار کے ساتھ ایک دن بھی نہیں رہ سکتی۔"

مرینہ نے اس کی بات پر سہم کر ارد گرد دیکھا کہ کہیں کوئی سن نہ لے۔

" کیا...کیا حق کو پتا ہے؟ تمہارے اور اشعر کے اس افیئر کا اسے کوئی اندازہ ہے؟"

یہ سوال سماعت سے ٹکراتے ہی سلویٰ کے چہرے تاریک سا سایہ لہرایا۔

"مُجھے نہیں لگتا...اسے ذرا سا بھی شک نہیں ہے۔" سلویٰ نے دھیمے سے کہا۔

"تو وہ تم پر اندھا بھروسہ کرتا ہے۔" مرینہ نے اسے اس ہولناک سچائی کی یاد دہانی کروائی جو حق جیسے سرد انسان کے وجود کا ایک اچھوتا حصہ تھی۔
"اور اسی لیے...اسی لیے میں اب خلع چاہتی ہوں۔" سلویٰ نے حتمی اور نپے تلے لہجے میں جواب دیا، اس کے چہرے پر کوئی پشیمانی نہیں تھی۔ "میں اب مزید یہ چوہے بلی کا کھیل نہیں کھیل سکتی۔ حق کا یہ اندھا بھروسہ مُجھے روز مارتا ہے۔ میں اب اس جھوٹے رشتے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔ آج ہی میں اپنی لائر سے ملنے والی ہوں اور ہم خلع کے قانونی پہلوؤں پر فائنل بات کریں گے۔"

مرینہ نے اس کے اس پکے ارادے کو دیکھ کر مزید کچھ کہنا فضول سمجھا، اس نے صرف خاموشی سے اپنا سر ہلا دیا۔ یہ سلویٰ کی زندگی تھی، اور یہ اسی کا آخری فیصلہ تھا۔ آخر کو ساتھ تو اسے اپنی دوست کا ہی دینا تھا۔ دونوں اب پول کے اندر کھڑی تھیں، پانی کی لہریں ان کے وجود سے ٹکرا رہی تھیں۔ سلوی اب مرینہ کی کسی بات پر ہنس رہی تھی۔ بالکل اسی لمحے، فضا میں ایک عجیب سی سنگینی چھا گئی۔ سلویٰ کو اچانک اپنے بائیں جانب موجود ایک بڑے سنگِ مرمر کے ستون کی اوٹ سے اپنے وجود پر دو جھانکتی ہوئی نظروں کی شدید تپش محسوس ہوئی۔ وہ تپش اتنی تیز، اتنی جلتی ہوئی اور اتنی حقیقی تھی کہ سلویٰ کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے ایک جھرجھری لیتے ہوئے فوراً جھٹکے سے اپنا رخ موڑا اور اس مخصوص ستون کی طرف دیکھا۔ مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ ستون کے پیچھے صرف اندھیرا تھا اور وہاں لٹکے ہوئے برقی قمقمے تیز ہوا کے باعث ہلکے سے جھول رہے تھے۔ وہاں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا مگر وہ جلتی ہوئی نظریں اپنا مہیب احساس سلویٰ کے وجود پر چھوڑ چکی تھیں۔

☆...☆...☆

کچھ گھنٹے بعد شہر کے ایک مہنگے کارپوریٹ بلاک کی پانچویں منزل پر واقع وہ قانونی دفتر کسی بڑے ہوٹل کے لاؤنج کا منظر پیش کر رہا تھا۔ مہوگنی کی چمکتی ہوئی بڑی میز، چمڑے کی کرسیاں اور سامنے شیشے کی بڑی دیوار کے پار شہر کا ایک وسیع منظر پھیلا ہوا تھا۔ سلویٰ اس وقت گہرے نیلے رنگ کے سوٹ میں ملبوس، اپنے بائیں ہاتھ کی انگلیوں کو سختی سے آپس میں بنے، بیرسٹر عائلہ کے سامنے بیٹھی تھی۔ بیرسٹر عائلہ اپنے شعبے کی ایک حد درجہ شاطر اور مہنگی ترین طلاق کی ماہر وکیل مانی جاتی تھیں، انہوں نے اپنے مہنگے چشمے کو ناک پر ٹکاتے ہوئے سلویٰ کی فائل کھولی۔ ایلیٹ کلاس کی طلاقیں کبھی سادہ نہیں ہوتیں تھیں۔ ان کے پیچھے کروڑوں کے اثاثے، خاندانی ساکھ اور انا کا کھیل ہوتا تھا اور جب سامنے حق بزدار جیسا طاقتور نام ہو تو قدم بہت پھونک پھونک کر رکھنا پڑتا ہے۔

"تو سلویٰ خان تم نے اپنا ارادہ نہیں بدلا؟" عائلہ نے قلم کی نوک میز پر ٹکاتے ہوئے براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"میں اپنا ذہن بنا چکی ہوں، عائلہ۔ مُجھے ہر قیمت پر حق سے علیحدگی چاہیے۔" سلویٰ کی آواز میں بلا کا ٹھہراؤ تھا۔ وہ کئی مہینے سوچنے سمجھنے کے بعد یہ فیصلہ کر چکی تھی۔
عائلہ نے ایک گہرا سانس لیا اور نوٹ پیڈ پر کچھ لکھتے ہوئے انتہائی پیشہ ورانہ اور بے تاثر لہجے میں سوالات کی بوچھاڑ شروع کر دی۔

"دیکھو اگر ہمیں حق بزدار جیسے مرد کے خلاف ایک مضبوط کیس تیار کرنا ہے تو مجھے عدالت اور سیٹلمنٹ ٹیبل کے لیے کچھ ٹھوس بنیادیں چاہئیں ہوں گی۔ سب سے پہلے مُجھے یہ بتاؤ... کیا حق کا رویہ تمہارے ساتھ Abusive ہے؟ کیا وہ تم پر ہاتھ اٹھاتا ہے، گالی گلوچ کرتا ہے یا کسی قسم کی ذہنی و جسمانی اذیت دیتا ہے؟"

"نہیں... کبھی نہیں۔" سلویٰ نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔ "حق نے آج تک مجھ پر نہ کبھی ہاتھ اٹھایا ہے اور نہ ہی کبھی اونچی آواز میں بات کی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" عائلہ نے اگلا پوائنٹ لکھا۔ "کیا وہ ضرورت سے زیادہ شکی مزاج ہے؟ کیا وہ تمہاری آزادی پر پابندیاں لگاتا ہے، تمہارے فون چیک کرتا ہے یا تمہاری سماجی زندگی کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرتا ہے؟"

"نہیں...وہ مجھ پر حد سے زیادہ بھروسہ کرتا ہے۔وہ مجھے پوری آزادی دیتا ہے۔" سلویٰ کا لہجہ اب تھوڑا بوجھل ہو گیا تھا۔بیرسٹر عائلہ نے چند لمحوں کے لیے اپنے ہاتھ میں تھما قلم روکا۔وہ سلویٰ کے قریب ہوئی اور اپنی آواز کو مزید دھیما اور نجی کرتے ہوئے،انتہائی ڈھکے چھپے اور نپے تلے قانونی الفاظ میں وہ سوال پوچھا جو عام طور پر نجی ازدواجی زندگی کی ہم آہنگی سے متعلق ہوتا ہے۔

"ہائی سوسائٹی میں اکثر شادیاں بند کمروں کے سرد رویوں کی وجہ سے ٹوٹتی ہیں۔میں تمہاری نجی اور ازدواجی زندگی کے بارے میں پوچھنا چاہتی ہوں...کیا تمہارے اور حق کے درمیان وہاں کوئی مسئلہ ہے؟ کیا تمہارا شوہر ذہنی اور جسمانی طور پہ تمہیں پسند نہیں؟ کیا وہ تمہیں چھوڑ کر کہیں اور وقت بتاتا ہے؟ کیا تمہاری ازدواجی زندگی خراب ہے؟ کیا تمہارا شوہر دوسرے مردوں یا عورتوں میں دلچسپی رکھتا ہے؟"

وکیل کے اس حد درجہ نجی سوال پر سلویٰ کا خوبصورت چہرہ سیکنڈ کے سویں حصے میں شدید پشیمانی اور شرمندگی سے یکلخت سرخ ہو گیا۔پھر اس نے گہرا سانس لیا خود پر ضبط کیا اور ایک ایک لفظ تول کر بولنا شروع کیا۔

"نہیں...ایسا بالکل نہیں ہے عائلہ!حق کا کبھی کوئی افیئر نہیں رہا۔حق بزدار...حق بزدار ایک بہترین مرد ہے۔وہ اپنی نجی زندگی اور اپنے ازدواجی حقوق میں کسی بھی لحاظ سے کمزور یا نااہل نہیں ہے۔وہ اس معاملے میں حد درجہ پرفیکٹ اور کیرنگ رہا ہے۔"

بیرسٹر عائلہ اب واقعی تعجب کا شکار ہو چکی تھی۔اس نے الجھن سے اپنی عینک اتاری۔ایلیٹ کلاس کے طلاق کے کیسز میں یا تو تشدد ہوتا تھا،یا شک،یا پھر نجی زندگی کی نااہلی اور سرد مہری۔مگر یہاں منظر بالکل الٹ تھا۔وہ دونوں ایک دوسرے کو عرصے سے جانتی تھیں۔

"تم میری الجھن کو سمجھنے کی کوشش کرو..." عائلہ نے میز پر ہاتھ پھیلاتے کہا۔

"تمہارا شوہر تمہارے ساتھ پرتشدد نہیں ہے،وہ تم پر شک نہیں کرتا،وہ تمہیں فنانشل اور سماجی آزادی دیتا ہے اور تمہاری نجی و ازدواجی زندگی میں بھی وہ ایک بہترین مرد ہے۔مزید یہ کہ تم دونوں کا ایک سپیشل چائلڈ بھی ہے جس کی وجہ سے حق خلع کے سخت خلاف ہے۔تو پھر آخر مسئلہ کیا ہے؟ تم کس بنیاد پر جج کے سامنے کھڑی ہو کر خلع مانگو گی؟"

وہ دونوں ایک دوسرے کو عرصے سے جانتی تھیں اور بیرسٹر عائلہ واقعی سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی سلوی کی پرفیکٹ لائف میں اچانک کیا ہو گیا تھا؟

"مسئلہ یہ ہے میں اب یہ زندگی نہیں جینا چاہتی۔"

سلویٰ نے ایک لمبی، گہری سانس لی اور عائلہ کی آنکھوں میں جھانکا۔اس نے اشعر کا نام یہاں لینا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ کسی دوسرے افیئر کا ذکر قانونی بساط پر اس کے اپنے خلاف جا سکتا تھا۔

"ہماری ذہنی ہم آہنگی ختم ہو چکی ہے۔حق اپنے ماضی اور حازق کے سائے سے باہر نہیں نکل پاتا اور میں اب بزدار پیلس کے اندھیروں میں گھٹ کر مرنا نہیں چاہتی۔مُجھے بس اپنی زندگی الگ چاہیے، چاہے اس کے لیے مُجھے اپنے سارے مالی حقوق ہی کیوں نہ چھوڑنے پڑیں۔"

بیرسٹر عائلہ نے اس کے چہرے کے پکے عزم کو دیکھا۔وہ کافی پریشان لگ رہی تھی۔پھر اس نے اور نوٹ پیڈ بند کرتے ہوئے سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے۔اگر تمہارا فیصلہ یہی ہے تو پھر ہم بغیر کسی الزام تراشی کے Irreconcilable Differences کی بنیاد پر خلع کے پیپرز تیار کرتے ہیں۔لیکن یاد رکھنا سلویٰ...حق بزدار جیسے شخص کو کورٹ کا نوٹس بھیجنا، ایک تپتے ہوئے بارود کے ڈھیر پر چنگاری پھینکنے کے برابر ہوگا۔میں اس خاندان کو اچھے سے جانتی ہوں۔باقی تمہاری مرضی!"

"مُجھے فرق نہیں پڑتا۔"سلوی نے قدرے سکون سے کہا تو عائلہ نے سر ہلا دیا۔مسٹر خان کا نام بھی کوئی چھوٹا موٹا نہیں تھا اور سلوی ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔کیس دونوں سے مضبوط تھا جانے نتیجہ کیا نکلتا۔

☆...☆...☆

نشاطِ صبح کے شاندار ٹی وی اسٹوڈیو کا پرائیویٹ گرین روم تیز، سفید روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔آئینے کے چاروں طرف لگے بلب نشاط بزدار کے چہرے کو مزید نمایاں کر رہے تھے۔نشاط اس وقت اپنے مشہور مارننگ شو کی تیاری میں ایک نفیس سلک کی ساڑھی پہنے ماتھے پر تیوری چڑھائے بیٹھی تھی اور اندرونی طور پر سخت جھنجھلاہٹ کا شکار لگ رہی تھی۔اس کے بالکل سامنے، اس کا پرسنل میک اپ آرٹسٹ اور سب سے قریبی راز دار آر بی جھکا ہوا تھا۔آر بی اپنی ٹرانس جینڈر شخصیت، نپے تلے نازنخروں اور تیز طرار گفتگو کے لیے پورے میڈیا انڈسٹری میں مشہور تھا۔وہ اس وقت انتہائی مہارت سے نشاط کے گالوں پر بلش آن ٹھیک کر رہا تھا۔اس کی انگلیوں کی حرکت میں ایک جادو تھا مگر اس کی

نظریں آئینے میں نشاط کے بدلے ہوئے تاثرات کو صاف پڑھ رہی تھیں۔ آربی نے ایک ہلکی سی ادا کے ساتھ بلش کا برش پیچھے ہٹایا اور ایک ابرو اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں تو میری جان! کیا اپڈیٹ ہے پھر؟ نجف صاحبہ نے اجازت دے دی صبا کو شو پر لانے کی؟"

نشاط نے آئینے میں آربی کو دیکھا، اس کے خوبصورت چہرے پر تپش ابھر آئی۔ اس نے اپنے ہاتھ کی مٹھیاں بھینچ لیں۔

"نجف تو جیسے اس ریپ وکٹم صبا کی سگی محافظ بن کر بیٹھ گئی ہے۔" نشاط کی آواز میں شدید جھنجھلاہٹ تھی۔ "کہتی ہے کہ صبا کی ذہنی حالت ابھی اس قابل نہیں ہے کہ وہ لائیو کیمروں کے سامنے آ کر اپنے ساتھ ہونے والی درندگی کا اعتراف کرے۔ وہ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے مُجھے آفیشل پرمیشن دینے کو تیار ہی نہیں ہے۔"

"سچ کہوں نش؟ آپ کی یہ بہن نجف کچھ زیادہ ہی نخریلی اور ضدی ہے۔" آربی اسے پیار سے نش بلاتا تھا۔ "توبہ ہے چمکتے دمکتے ڈاکٹرز کا یہ نخرہ! اپنے آگے تو جیسے کسی کو کچھ سمجھتے ہی نہیں ہیں۔ نجف کو سمجھنے چاہیے کہ وہ لڑکی شو پر آئے گی تو اسے انصاف ملے گا نا، میڈیا کا پریشر بنے گا تو پولیس حرکت میں آئے گی۔"

"اب سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلے گا آربی۔" نشاط نے گہرا سانس لیتے ہوئے اپنے جھمکے درست کیے۔ "اب مُجھے براہِ راست ڈیڈ سے ہی بات کرنا ہوگی۔ نجف صرف ان کی بات مانتی ہے۔ جب ڈیڈ کا فون جائے گا تو اس کے سارے اصول اور ساری میڈیکل رپورٹیں دھری کی دھری رہ جائیں گی۔"

آربی نے اب آئی لائنر کا برش اٹھایا اور انتہائی نفاست سے نشاط کی پلکوں کے کنارے کو چھوتے ہوئے بولا۔

"ایگزیٹلی! تمہیں یہ پہلے ہی کر لینا چاہیے تھا۔ ویسے یہ لڑکی شو پر آ گئی تو شو کی ریٹنگ آسمان چھونے لگے گی۔"

"میں صرف ریٹنگز کے لیے نہیں کر رہی۔" نشاط کا لہجہ یکدم حد درجہ سنجیدہ اور بوجھل ہو گیا۔ "میں چاہتی ہوں کہ صبا اسٹوڈیو میں بیٹھ کر اس درندے کا نام لے تاکہ دنیا کو پتا چلے کہ جب کسی عورت کی روح کو کچلا جاتا ہے، تو درد کیا ہوتا ہے۔ میں اس درندے کو سڑک پر گھسیٹنا چاہتی

ہوں۔"

آربی نے نشاط کے لہجے کی اس چھپی ہوئی تڑپ اوراس کے ماضی کے کرب کوفوراً محسوس کرلیا۔وہ جانتا تھا کہ نشاط جب بھی کسی ریپ کیس پر بات کرتی تھی تو وہ دراصل اپنے اندر کے زخم کی آگ کو ہوا دے رہی ہوتی تھی جو دس سال پہلے سقراط شبکیر نے اسے دیا تھا۔آربی نے برش میز پر رکھا،اس کے چہرے سے شرارت غائب ہوگئی اور وہ ایک سچے مخلص دوست کے روپ میں سامنے آیا۔اس نے نرمی سے نشاط کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"نش! میں تمہارا درد سمجھتا ہوں اور تمہارا جذبہ بھی سچا ہے۔لیکن میرا یہ اچھے والا مشورہ یاد رکھنا۔ریٹنگز،میڈیا ٹرائل،اور یہ سنسنی خیز شوز تو آتے جاتے رہیں گے...مگر وہ لڑکی؟ وہ ایک ٹوٹا ہوا شیشہ ہے۔اگر نجف منع کر رہی ہیں تو شاید وہ اس لڑکی کے دماغ کی لکیریں دیکھ رہی ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ انصاف دلانے کے اس چکر میں،لائیو کیمروں کی یہ چمکتی ہوئی لائٹس اس معصوم لڑکی کے بچے کچے اعصاب کو ہمیشہ کے لیے پاگل کر دیں۔"

نشاط نے آئینے میں آربی کی سنجیدہ آنکھوں کو دیکھا۔آربی کے اس گہرے اور منطقی مشورے نے اسے ایک پل کے لیے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔آربی ہمیشہ اس کے ساتھ کھڑا رہتا تھا اور جب بھی وہ جذبات میں آ کر کوئی غلط قدم اٹھانے لگتی تو وہ اسے سچ کا آئینہ دکھا دیتا تھا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو،آربی...لیکن میں اب پیچھے نہیں ہٹ سکتی۔"نشاط نے ایک مضبوط فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔اسی لمحے گرین روم کے دروازے پر لگی ریڈ لائٹ ٹمٹمائی جو اس بات کا سگنل تھا کہ شو کا وقت شروع ہونے میں صرف چند منٹ باقی تھے۔

"لو بھئی...ہو گیا تمہارا چارم ٹائم!" آربی نے یکدم اپنا روایتی چلبلا روپ واپس اوڑھ لیا۔اس نے جلدی سے نشاط کے گلے کا سیٹ درست کیا اور پرفیوم کا ایک آخری اسپرے فضا میں بکھیر دیا۔"اب جاؤ اور اسکرین پر آگ لگا دو مائی کوئین! باقی ڈیڈ سے بات شو کے بعد کرنا۔"

نشاط نے مسکرا کر آربی کا شکریہ ادا کیا،کرسی چھوڑی اور پورے اعتماد کے ساتھ گرین روم سے باہر اسٹوڈیو کے سیٹ کی طرف بڑھ گئی۔بساط پر ایک اور مہرہ چلنے والا تھا،اور اس بار اس کا رخ اپنے ہی خاندان کی ڈاکٹر کی طرف تھا۔

☆...☆...☆

رات کا ایک بج رہا تھا۔ ڈاکٹر یاور بلیک کافی کا مگ لیے، اسٹڈی روم میں داخل ہوئے۔ گو کہ سردیوں کی شدت پہلے سے کم ہو چکی تھی مگر رات کی سردی اب بھی کھڑکی کے شیشوں کے پار محسوس ہو رہی تھی۔ وہ میز پر جھکے ایک فائل کے صفحات پلٹ رہے تھے کہ انہیں اپنی پشت پر تیز تپش محسوس ہوئی۔ اگلے ہی پل وہ ایک جھٹکے سے پلٹے۔ کھڑکی سے آتی اسٹریٹ لائٹ کی مدہم روشنی کمرے میں رکھے صوفے پر پڑی جہاں ایک مہیب سایہ موجود تھا۔ ڈاکٹر یاور نے چونک کر دیکھا اور خوف کی ایک سرد لہر ان کی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی۔ حق بزدار وہاں بیٹھا تھا۔ اس کا کوٹ صوفے کی پشت پر تھا، آستینیں کہنیوں تک چڑھی ہوئی تھیں اور اس کی نیلی آنکھیں اندھیرے میں کسی بھیڑیے کی طرح چمک رہی تھیں۔ وہ بغیر کسی آواز کے، یاور کے سیکیورٹی سسٹم کو بائی پاس کر کے اسکے فلیٹ میں داخل ہو چکا تھا۔

"ڈاکٹر حق؟ آپ...اس وقت یہاں؟" یاور نے حیرت اور گھبراہٹ کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ مگ میز پر رکھا۔

"باہر ہوا بہت ٹھنڈی ہے یاور صاحب!" حق نے انتہائی نارمل اور دھیمے لہجے میں کہا۔ "میں بس اس طرف سے گزر رہا تھا تو سوچا اپنے ہسپتال کے سینیئر سرجن کی خیریت ہی معلوم کر لوں۔"

بات بالکل عام سی تھی، لہجہ بھی روایتی تھا مگر ڈاکٹر یاور کے اعصاب یکلخت تن گئے۔ حق بزدار کا رات کے اس پہر یوں بن بلائے آنا اور اس کی آنکھوں میں چھپا وہ ماورائی سکون... یاور کی چھٹی حس چلا اٹھی...کچھ بہت غلط تھا۔ کمرے کی فضا سیکنڈوں میں بوجھل ہو گئی۔

"سب خیریت تو ہے نا؟ آپ کا اس طرح آنا...کچھ غلط ہوا ہے کیا؟" یاور نے اپنی آواز کو مستحکم رکھنے کی ناکام کوشش کی۔

حق کے لبوں پر ایک مبہم مسکراہٹ ابھری۔ اس نے اپنے کوٹ کے اندرونی خانے سے ایک مہر بند سیاہ فائل نکالی اور اسے آہستہ سے سرکا کر اپنے سامنے میز پر رکھ دی۔ ڈاکٹر یاور اسکی جانب بڑھا۔

"غلط تو بہت پہلے ہو چکا تھا، بس اس کا حساب آج رات ہوگا۔"

یاور میز کے قریب پہنچ کر لرزتے ہاتھوں سے فائل کھولی۔ جیسے ہی اس کی نظر اندر موجود تصاویر، کار کی پرانی رجسٹریشن اور پولیس رپورٹ پر پڑی، اس کا پورا وجود اندر تک لرز اٹھا۔ یہ اس کی ذاتی زندگی کا وہ خونی راز تھا جسے انہوں نے سات سال پہلے انڈس ہائی وے پر ایک غریب

فیملی کو اپنی گاڑی کے نیچے کچل کر، اور اپنے بوڑھے ڈرائیور کو رقم دے کر جیل بھیج کر دفن کیا تھا۔

یاور نے گہرا سانس لیا۔ انہوں نے فائل بند کی اور اپنے چہرے پر مصنوعی سختی لائے کہا۔

"یہ پرانا قصہ ہے حق! اس کا بزدار ہسپتال سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" یاور نے غصے سے کہا۔

"بالکل ٹھیک اس کا ہسپتال سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" حق نے دائیں ہاتھ سے اپنے بالوں کو پیچھے کی جانب سیٹ کیا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟" ڈاکٹر یاور اپنے خشک ہونٹ تر کرتے ہوئے اسکے سامنے بیٹھ گیا۔ ان کے درمیان صرف ایک میز کا فاصلہ تھا۔

"میں چاہتا ہوں تم ریزائن کر دو۔" حق قدرے سکون سے بولا۔

" کیا بکواس ہے یہ؟" ڈاکٹر یاور تپ اٹھا۔

" بکواس؟" حق نے مصنوعی حیرانی سے بولا۔ "سات سال پہلے، انڈس ہائی وے پر رات کے اندھیرے میں تم نے شراب کے نشے میں دھت ہو کر اپنی نجی کار ایک غریب موٹر سائیکل سوار فیملی پر چڑھا دی تھی۔ ایک باپ اور اس کا آٹھ سالہ بچہ موقع پر دم توڑ گئے تھے۔ تم نے اپنے اثر و رسوخ اور پیسے کے بل بوتے پر نہ صرف اس کیس کو دبایا بلکہ اپنے بوڑھے، وفادار گھریلو ڈرائیور کو رقم کا لالچ دے کر اس جرم کا مہرہ بنا دیا۔ وہ بوڑھا تمہارا گناہ اپنے سر لے کر جیل گیا اور وہیں تڑپ تڑپ کر مر گیا۔"

ڈاکٹر یاور نے بے یقینی سے حق کو دیکھا۔

"مزید بکواس یہ ہے کہ اس فائل میں اس بوڑھے ڈرائیور کے مرنے سے پہلے کا اصل ریکارڈنگ بیان ہے، اس برباد ہونے والی فیملی کے بیانات ہیں اور اس پولیس افسر کا اعترافِ نامہ ہے جسے تم نے کروڑوں روپے رشوت دی تھی۔ اگر یہ فائل صبح عدالت اور میڈیا کے پاس چلی گئی، تو ہاسپٹل کا تو کچھ نہیں بگڑے گا یاور... مگر تم پر قتلِ عمد اور عدالت کو گمراہ کرنے کا ایسا کیس چلے گا کہ تمہاری باقی کی زندگی جیل کی اسی کال کوٹھڑی میں چپس کاٹتے گزرے گی۔"

ڈاکٹر یاور کا چہرہ سیکنڈوں میں کاغذ کی طرح سفید پڑ گیا۔ یہ ریکارڈنگ بیان والی بات سچی تھی یا جھوٹی وہ نہیں جانتا تھا مگر حق کے لیے اسے سچ ثابت کرنا کچھ مشکل نہیں تھا۔

"تم مُجھے ہسپتال سے کیوں نکالنا چاہتے ہو؟"

" کیونکہ مُجھے تمہاری شکل نہیں پسند!" حق کے سکون میں کوئی کمی نہیں آئی۔

"تم شاید بھول رہے ہو کہ ہسپتال کے بورڈ میں ڈاکٹر شمس میرے ساتھ کھڑے ہیں۔تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے!"

"اچھا..." حق جیسے محظوظ ہوا۔ "پھر تم میرے بارے میں جانتے نہیں ہو یاور..."

اگلے ہی پل اسکی آنکھیں یکلخت تاریک ہوئیں۔اس کے چہرے سے وہ عارضی نرمی اب ایسے غائب ہوئی جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔ یاور کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں ابھرنے لگیں مگر اس نے ہمت نہیں چھوڑی۔

"جانتا ہوں... شمس بالکل ٹھیک کہتا ہے تمہارے بارے میں۔تم انسان نہیں، مونسٹر ہو!"

یہ جملہ سنتے ہی حق کے جبڑے بھنچ گئے۔اس نے میز پر اپنے دونوں بھاری ہاتھ جمائے اور ایک جھٹکے سے آگے کی طرف جھکتے ہوئے اپنا چہرہ لرزتے ہوئے ڈاکٹر یاور کے بالکل قریب کر دیا۔

Then bear me!

(تو پھر اس مونسٹر کو برداشت کرو۔)

کمرے میں جیسے آکسیجن ختم ہو گئی۔حق کا چہرہ اب بھی یاور کے چہرے کے بالکل قریب تھا۔

"اگر صبح کی پہلی کرن کے ساتھ یہ فائل، اس بوڑھے ڈرائیور کا مرنے سے پہلے ریکارڈڈ اصل اعترافِ جرم اور اس پولیس افسر کا بیانیہ ہائی

وے اتھارٹی اور میڈیا کے پاس پہنچ گیا تو ڈاکٹر شمس تمہیں بچانا تو دور، میڈیا کے سامنے تمہاری لاش پہچاننے سے بھی انکار کر دے گا۔تم صرف ہسپتال سے نہیں جاؤ گے یاور...تم پر قتلِ عمد کا کیس چلے گا اور تم جیسے ہوس کے پجاری کو جب سینٹرل جیل کی اس کال کوٹھڑی میں ننگے فرش پر پھینکا جائے گا نا تو وہاں شمس تمہاری ضمانت کے لیے بھی نہیں آئے گا۔"

حق نے اٹھتے ہوئے اپنی پینٹ کی جیب سے دو پیپر نکالے اور میز پر پٹخ دیے۔ایک جونیئر نرسوں کو ہراس کرنے کا آفیشل معافی نامہ تھا اور دوسرا بزدار ہسپتال سے فوری، غیر مشروط ریزائن تھا۔

"سائن کرو اس پر۔ابھی اور اسی وقت! ورنہ کل کی دھوپ تم اپنے اس عالیشان اپارٹمنٹ میں نہیں دیکھو گے اور نہ ہی کبھی اپنی فیملی سے مل پاؤ گے۔"

حق نے اسٹڈی ٹیبل سے پین اٹھا کر یاور کی لرزتی انگلیوں میں زبردستی تھمایا۔ڈاکٹر یاور کا سارا غرور، ساری اکڑ اور ڈاکٹر شمس کا آسرا مٹی میں مل چکا تھا۔

"میں نے کبھی کسی کو ہراس نہیں کیا۔کبھی کسی سے غلط بات نہیں کی میں تو بس...تت...تمہیں کسی نے غلط گائیڈ کیا ہے۔"

"ڈاکٹر یاور! میں نے کہا مُجھے آپ کی شکل نہیں پسند۔میں اسے روز ہسپتال میں نہیں دیکھ سکتا۔" وہ طنزیہ مسکرایا۔ڈاکٹر اب ایک ہارے ہوئے، لاچار مہرے کی طرح گھٹنوں کے بل آ چکا تھا۔اس کے ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے۔

" کیا مُجھے ایک اور موقع نہیں مل سکتا۔میں قسم اٹھاتا ہوں میں کبھی کسی کو غلط نظر سے نہیں دیکھوں گا۔"

"مُجھے دیر ہو رہی ہے ڈاکٹر یاور! میں دوبارہ نہیں کہوں گا۔" حق نے گھڑی پہ نظر ڈالتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔یاور نے مزید کچھ کہے بنا بند آنکھوں کے ساتھ دونوں پیپرز پر اپنے دستخط ثبت کر دیے۔حق نے ایک ہی جھٹکے سے وہ کاغذات واپس کھینچے، انہیں اپنے کوٹ میں محفوظ کیا اور بنا مڑے، رات کے اندھیرے اپارٹمنٹ سے جیسے غائب ہو گیا۔ڈاکٹر یاور اسی صوفے پر سر ٹکائے ساکت بیٹھا رہا گیا۔وہ اب زندگی میں دوبارہ پورے قد سے کھڑے ہونے کے قابل نہیں رہا تھا۔

☆...☆...☆

وقت نے پھر ایک بند صفحہ الٹ دیا۔

یہ سوئٹزلینڈ کے ایک پرسکون، خوبصورت ہل اسٹیشن پر واقع نجی ریزورٹ کے لان کا منظر تھا۔ سالوں پہلے کی یہ صبح خنکی سے بھری مٹیالی ہوا اور پہاڑوں کے پیچھے سے ابھرتی ہوئی نرم، سنہری دھوپ سے دھلی ہوئی تھی۔ لان کی ہری گھاس پر شبنم کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے اور فضا میں پرندوں کی چہچہاہٹ کے ساتھ ایک مانوس، پرسکون سا قہقہہ گونج رہا تھا۔ لان کے وسط میں بچھی لکڑی کی میز پر گرم چائے کی کیتلی اور ناشتے کا سامان سجا تھا۔ وجیہہ سے امام بزدار سویٹر پہنے بیٹھے تھے۔ میز سے کچھ دوری پر، بارہ سالہ حازق گھاس پر بیٹھا لکڑی کے رنگین بلاکس سے ایک گھر بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ حازق کی معصوم آنکھیں اور چہرے کی مخصوص ساخت اس کے وجود کی پاکیزگی کو عیاں کرتی تھیں۔ اس کے بلاکس بار بار گر جاتے تھے، جس پر وہ جھنجھلا کر اپنے ہاتھ ہلاتا۔ جب وہ کامیاب نہیں ہو پایا تو اس نے غصے میں آ کر بلاکس پھینکنے شروع کر دیے۔

" کوئی بات نہیں، میرا شہزادہ... ہم اسے دوبارہ بنائیں گے۔" آصفہ سکندر کی نرم اور محبت پاش آواز گونجی۔ وہ حازق کے بالکل برابر میں گھاس پر، اپنی مہنگی چادر کی پروا کیے بغیر بیٹھ گئیں۔ آصفہ اپنی سحر انگیز شخصیت کے ساتھ حازق کے وجود پر جھکی اور اس کی مدد کرنے لگیں۔ اس نے نہ ہی کبھی حازق کو کمزور سمجھا تھا اور نہ ہی اس کی بیماری کو بیچارگی کا نام دیا۔ وہ اسے ایک نارمل بچے کی طرح مگر دگنی محبت اور بے پناہ صبر کے ساتھ ٹریٹ کرتی تھیں۔ انہوں نے حازق کا تھوڑا سا ٹیڑھا بلاک اپنے نرم ہاتھ سے سیدھا کیا اور اس کے گال پیار سے چوم لیا۔

"دیکھو حازق! بابا اور حق کی طرح ہمارا گھر بھی اب بالکل پکا بنے گا۔ چلو، یہ آخری ریڈ بلاک اس کے اوپر رکھو۔" آصفہ نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ حازق نے اپنی ماں کی محبت بھری آنکھوں کو دیکھا، اس کے چہرے پر کھلکھلاتی ہوئی معصوم مسکراہٹ ابھری۔ اس نے تالی بجاتے ہوئے کہا۔

"مما... گھر... پکا گھر!"

بالکل اسی لمحے، لان کے دوسرے کونے سے آٹھ سالہ حق بھاگتا ہوا وہاں آیا۔ اس کی آنکھیں اس وقت بچپن کی معصومیت اور شرارت سے چمک رہی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا پائن کون تھا جو اس نے درخت سے گرتے ہوئے پکڑا تھا۔

"حازق دیکھو... یہ میں تمہارے لیے کیا لایا ہوں!" حق نے حازق کے پاس بیٹھتے ہوئے وہ پائن کون اس کے کھلونوں کے درمیان رکھ دیا۔ حازق نے خوشی سے حق کو دیکھا اور پائن کون اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا۔

Haq...you are my hero!

(حق تم میرے ہیرو ہو!)

"بالکل حق ہیرو ہے اور حق ہمیشہ حازق کی حفاظت کرے گا۔ ہے نا حق؟" آصفہ نے حق کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے محبت سے پوچھا۔

Always Mamma!

(ہمیشہ کروں گا، مما!)

آصفہ دونوں کو وہیں چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ امام بزدار میز پر بیٹھے یہ منظر دیکھ کر دھیمے سے مسکرائے۔ انہوں نے چائے کا مگ اٹھایا اور آصفہ کو دیکھا۔

"آصفہ، تم نے حازق کو واقعی بہت مضبوط بنا دیا ہے۔ مُجھے کبھی کبھی حیرت ہوتی ہے کہ تمہارا یہ صبر کہاں سے آتا ہے۔"

آصفہ نے مڑ کر امام کو دیکھا، ان کی محبت کی شادی کے یہ سال ان کی زندگی کے حسین ترین دن تھے۔

"یہ میرا بچہ ہے، امام! یہ اللہ کا دیا ہوا ایک معصوم تحفہ ہے۔ یہ جتنا معصوم ہے، میری محبت اس کے لیے اتنی ہی سچی ہے۔ آپ تینوں ہی تو میری کائنات ہیں۔"

امام بزدار اٹھے، وہ چلتے ہوئے اپنی بیوی اور بچوں کے پاس آئے۔ انہوں نے جھک کر حازق کے بالوں کو پیار سے بگاڑا اور حق کو اپنی گود میں اٹھا لیا۔ سوئٹزرلینڈ کی اس بھیگتی ہوئی صبح میں ان سب کی زندگی بہت خوبصورت تھی۔

☆...☆...☆

کمرے میں اس وقت حد درجہ بوجھل خاموشی طاری تھی۔ نجف اپنی میز پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے ایک میڈیکل فائل کھلی تھی، جس پر جرمنی کے ایک مایاناز کارڈیک انسٹی ٹیوٹ کا مونوگرام چھپا تھا۔ یہ فائل اس کی اپنی زندگی کی سب سے بڑی سچائی تھی اور سب سے بڑا راز بھی۔ آج سے ٹھیک پانچ سال پہلے، جرمنی کے اسی ہسپتال میں نجف کا ہارٹ ٹرانسپلانٹ ہوا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ آہستہ سے اپنے سینے پر رکھا۔ پسلیوں کے پیچھے ایک دھڑکن جاگ رہی تھی۔ ایک باقاعدہ اور زندہ دھڑکن... مگر یہ دل اس کا اپنا نہیں تھا۔ یہ کسی اور کا تھا، جو پانچ سال سے اس کے وجود کو زندگی کی تپش دے رہا تھا۔ وہ ایک ڈاکٹر تھی اور جانتی تھی کہ جسم تو سنبھل جاتا ہے مگر روح اس پرائے لمس کو کبھی نہیں بھول پاتی۔ ایک گہرا سانس لے کر، اس نے میز پر رکھا اپنا موبائل فون اٹھایا اور جرمنی کا وہ مخصوص انٹرنیشنل نمبر ڈائل کر دیا جو اس کی فائل پر درج تھا۔ کچھ سیکنڈز کی بیل کے بعد، دوسری طرف سے ہسپتال کے ریسپشنسٹ کی باادب انگریزی آواز ابھری۔ نجف نے اپنے لہجے کو جتنا ہو سکتا تھا، پرسکون رکھا۔

"ہیلو، میں ڈاکٹر نجف بزدار بات کر رہی ہوں، پاکستان سے..." نجف نے جرمن ہسپتال کے کوآرڈینیٹر کو اپنا کیس نمبر اور پرانی ہسٹری بتاتے ہوئے کہا۔ "آج سے ٹھیک پانچ سال پہلے، اسی ہسپتال میں میرا ہارٹ ٹرانسپلانٹ ہوا تھا۔ میں ایک ڈاکٹر ہوں اور طبی بنیادوں پر اور اپنی ذاتی تسکین کے لیے، یہ جاننا چاہتی ہوں کہ وہ دل کس کا تھا؟ مُجھے اس ڈونر کی شناخت چاہیے۔"

دوسری طرف چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔ کمپیوٹر کے کی بورڈ پر انگلیوں کی ٹائپنگ کی آواز آئی اور پھر کوآرڈینیٹر کا لہجہ انتہائی معذرت خواہانہ ہو گیا۔

"ہم انتہائی معذرت خواہ ہیں، ڈاکٹر نجف۔ ہم یہ معلومات آپ کو فراہم نہیں کر سکتے۔" دوسری طرف سے صاف انکار کر دیا گیا۔ "یہ ہمارے ہسپتال اور بین الاقوامی قوانین کے تحت ایک انتہائی کانفیڈینشل معاملہ ہے۔ جس فیملی نے یہ ہارٹ ڈونیٹ کیا تھا، انہوں نے ہسپتال سے رخصت ہوتے وقت سخت قانونی کاغذات پر سائن کیے تھے۔ وہ اپنی شناخت کو مکمل پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے۔"

نجف کے چہرے پر مایوسی کا ایک گہرا سایہ لہرایا۔ "کیا کوئی بھی طریقہ نہیں ہے؟ میں صرف ان کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔"

"آئی ایم سوری، ڈاکٹر۔ ہمارے پاس بھی ان کے بارے میں مزید کوئی تفصیلات محفوظ نہیں ہیں۔ان کی فیملی نے اپنے تمام روابط ختم کر دیے تھے۔"

نجف فون بند کرنے ہی والی تھی کہ دوسری طرف موجود شخص نے اخلاقی طور پر ایک آخری جملہ کہا جو شاید وہ بتا سکتا تھا۔

"ڈاکٹر نجف...ڈونر ایک بائیس سالہ لڑکی تھی۔"

کال کٹ گئی۔لائن ڈسکنیکٹ ہو چکی تھی۔نجف نے آہستہ سے فون میز پر واپس رکھا۔کمرے میں دوبارہ وہی مہیب سناٹا لوٹ آیا۔وہ لڑکی کون تھی؟ایک اتنی کم عمر لڑکی کی زندگی ختم ہونے پر اسے نئی زندگی ملی تھی۔کاش وہ اسے ایک بار دیکھ پائے۔جان پائے کی وہ کیسی تھی؟ کون تھی؟ کیا کرتی تھی اور...بہت سے سوال تھے مگر جواب ڈھونڈنے فی الوقت مشکل ہو رہے تھے۔

☆...☆...☆

شہر کے مضافات میں واقع ایک سنسان، متروکہ فیکٹری کا زیرِ زمین تہہ خانہ اس وقت موت کے سکوت میں ڈوبا ہوا تھا۔چھت سے لٹکتا ہوا ایک اکیلا، زرد بلب ہلکی ہوا سے دھیمے دھیمے جھول رہا تھا جس کی وجہ سے دیواروں پر سائے رقص کر رہے تھے۔ کمرے کے وسط میں ایک لوہے کی کرسی پر وہ شخص مضبوط رسیوں سے جکڑا ہوا تھا، جس نے چند گھنٹے پہلے امجد بزدار کو فون پر اکتیس سال پرانے راز کی دھمکی دی تھی۔ اس کا چہرہ سوجا ہوا تھا اور ماتھے سے بہتا ہوا خون اس کی آنکھوں کے پاس جم چکا تھا۔اچانک لوہے کا بھاری دروازہ کھلا اور امجد بزدار برفانی تاثرات کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ان کے پیچھے اقبال بزدار آ رہا تھا، جس کے ہاتھ میں ایک چمکتا ہوا سٹیتھو سکوپ تھا۔ بلیک میلر نے جیسے ہی امجد بزدار کو دیکھا، اس کی آنکھوں میں موت کا خوف ناچنے لگا۔وہ رسیوں جکڑا میں بے طرح کسمسایا۔

"بزدار صاحب! خدا کے لیے...مُجھے معاف کر دیں۔مجھ سے غلطی ہو گئی! میں وہ راز کسی کو نہیں بتاؤں گا۔میں قسم کھاتا ہوں، میں ہمیشہ کے لیے شہر چھوڑ دوں گا!"

اکتیس سال پہلے وہ شخص ایک وارڈ بوائے تھا۔چوبیس سالہ وارڈ بوائے جو آج پچپن سال کا آدمی تھا اور اس نے اپنے آپ کو اتنا بڑا سمجھ لیا تھا کہ امجد بزدار کو بلیک میل کر سکے۔امجد بزدار اس کے بالکل سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔ان کے چہرے پر کوئی غصہ نہیں تھا، صرف گہری

سنجیدگی تھی۔انہوں نے جھک کراس کی خوف سے پھٹی آنکھوں میں دیکھا۔

"اکتیس سال..."ان کی گہری اور رعب دار آواز تہہ خانے کی پتھریلی دیواروں سے ٹکرائی۔"اکتیس سال ایک طویل عرصہ ہوتا ہے،ایک پوری عمر گزر جاتی ہے۔جس راز کو میں نے اکتیس سال پہلے اپنے ہاتھوں سے مٹی کی تہوں کے نیچے دفن کیا تھا اور اس کی تمہیں ایک قیمت دی گئی تھی...پھر تم نے کیوں سوچا کہ تم ایک سستے فون لائیو کال پر اسے کھود نکالو گے؟"

"نہیں...نہیں بزدار صاحب!میں مٹ جاؤں گا،میں اندھا بہرا بن جاؤں گا،مجھے جانے دیں!"وہ شخص اب پاگلوں کی طرح رو رہا تھا۔

"تم نے اپنی موت کا سودا اسی وقت کرلیا تھا جب تم نے میرا نمبر ڈائل کیا تھا۔"امجد بزدار سیدھے کھڑے ہوگئے اور اپنے کوٹ کے بٹن درست کیے۔" کچھ راز اتنے بھاری ہوتے ہیں کہ انہیں جاننے والے کی روح بھی اس زمین پر بوجھ بن جاتی ہے۔اور بزداروں کی بساط پر بوجھ رکھنے کی اجازت کسی کو نہیں ہے۔"

انہوں نے آہستہ سے ایک قدم پیچھے ہٹایا اور اقبال کو ایک خاموش سگنل دیا۔اقبال آگے بڑھا۔وہ کرسی کے پیچھے کھڑا ہوگیا۔اس نے اپنے ہاتھوں میں تھمے سٹیتھوسکوپ کی ربڑ کی نالی کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑا اور اسے ایک لچکدار لکیر کی طرح سیدھا کیا۔اس سے پہلے کہ وہ بلیک میلر کچھ سمجھ پاتا یا چیخ سکتا،اقبال نے بجلی کی سی تیزی سے وہ سٹیتھوسکوپ اس کے گلے کے گرد لپیٹا اور پورے وزن کے ساتھ پیچھے کی طرف کھینچ لیا۔بلیک میلر کی چیخ اس کے حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔سٹیتھوسکوپ کی مضبوط نالی اس کے ٹینٹوے میں بری طرح دھنس چکی تھی،جس سے اس کی ہوا کی نالی یکلخت بند ہوگئی۔اس کا چہرہ سیکنڈوں میں نیلا پڑنے لگا اور آنکھیں ابل کر باہر کو آنے لگیں۔وہ اپنی جکڑی ہوئی ٹانگوں اور ہاتھوں کو کرسی کے ساتھ مارنے لگا،لوہے کی کرسی فرش پر بری طرح کھڑکھڑائی۔اقبال کے ہاتھ لوہے کے بنے ہوئے تھے۔اس نے اپنے پیروں کو فرش پر جمایا اور سٹیتھوسکوپ کے پھندے کو مزید سختی سے گھونٹتا چلا گیا۔کمرے میں صرف بلیک میلر کے حلق سے نکلنے والی گھٹی گھٹی لرزتی آوازیں اور اس کی آخری سانسوں کی جدوجہد گونج رہی تھی۔امجد بزدار دور کھڑے،حددرجہ اطمینان اور سرد مہر نظروں سے زندگی کا یہ چراغ گل ہوتے دیکھ رہے تھے۔بلیک میلر کا تڑپتا ہوا وجود آہستہ آہستہ سست پڑنے لگا۔اس کی انگلیوں کی جکڑن ڈھیلی ہوئی اور اس کے سر کا جھٹکا ایک طرف کو ہوگیا۔اس کی کھلی،بے نور آنکھیں چھت کے زرد بلب کو تک رہی تھیں جہاں اب زندگی کا کوئی نشان باقی نہیں تھا۔دھڑکنیں ناپنے والے آلے نے آج ایک دھڑکن کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا تھا۔اقبال نے سٹیتھوسکوپ کو اس کے گلے سے ہٹایا۔لاش ایک بے جان مٹی کے ڈھیر کی طرح کرسی پر لٹک گئی۔ امجد بزدار نے ایک آخری نظر اس لاش پر ڈالی،ان کا اکتیس سال پرانا راز ایک بار پھر محفوظ ہو چکا تھا۔وہ مڑے اور لوہے کے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

"صفائی اچھے سے کروانا اقبال..."

اقبال نے اپنے ہاتھ صاف کرتے ہوئے سر ہلایا اور پھر دروازے کی جانب بڑھا۔امجد بزدار باہر نکل گئے،ان کے پیچھے اقبال بھی...اوران کے پیچھے لوہے کا بھاری دروازہ ایک جھٹکے سے بند ہو گیا جس نے اس تاریک سچ کو ہمیشہ کے لیے اپنے اندر دفن کر لیا۔

☆...☆...☆

قادری کالج کا وسیع وعریض اسپورٹس گراؤنڈ صبح کی دھوپ میں چمک رہا تھا۔ہاکی ٹیم کے کھلاڑی گراؤنڈ میں پسینہ بہا رہے تھے مگر آج فضا میں ایک عجیب سا تناؤ تھا۔گراؤنڈ کے وسط میں ہاتھ میں سیٹی اور ٹائم واچ تھامے سقراط کھڑا تھا۔اس کے چہرے کی سنجیدگی اور سخت گیر رویے نے پوری ٹیم کو خوف اور ڈسپلن کے ایک کڑے حصار میں جکڑ رکھا تھا۔جب سے انہوں نے سقراط پر حملہ کیا تھا اور سقراط نے ان کے حملے کو ناکام بنایا تھا تب سے پوری ٹیم خوفزدہ تھی کہ جانے سقراط ان کے ساتھ کیا کرے گا مگر اس نے کچھ بھی نہیں کہا۔نہ اس رات کا ذکر کیا اور نہ اس حملے کا...وہ پہلے دن کی طرح چل رہا تھا اور اس کے اس عمل ٹیم کو مزید شش وپنج میں ڈال دیا تھا۔پریکٹس شروع ہوئے آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا جب کیپٹن زاویار لاپرواہی کے ساتھ گراؤنڈ میں داخل ہوا۔اس کے کندھے پر ہاکی اسٹک تھی اور وہ اپنے لیٹ ہونے پر کسی پشیمانی کے بغیر سیدھا فیلڈ کی طرف بڑھا۔

"رک جاؤ،زاویار!"سقراط کی گراؤنڈ میں گونجی۔پورے عملے کے قدم وہیں رک گئے۔

زاویار نے چونک کر اسے کو دیکھا اور لاپرواہی سے بولا۔"یس،کوچ؟"

"آج تم پریکٹس نہیں کرو گے۔"سقراط نے بنا کوئی لچک دکھائے،حد درجہ سپاٹ لہجے میں حکم دیا۔

"میں ٹیم کا کیپٹن ہوں اور آپ مُجھے پریکٹس سے روک نہیں سکتے۔"زاویار کا پارہ یکلخت ہائی ہو گیا۔اس کی انا کو بری طرح ٹھیس پہنچی تھی۔

"اور میں ٹیم کا کوچ ہوں...ناؤ آؤٹ!"

زاویار غصے سے نیلا پیلا ہوگیا۔اس نے اپنی ہاکی زمین پر پٹخی اور اندر ہی اندر جلتا کڑھتا،طیش کے مارے پیر پٹختا ہوا گراؤنڈ سے باہر نکل گیا۔اسے اپنے ہی لڑکوں کے سامنے اس طرح نکالا جانا ہضم نہیں ہو رہا تھا۔گراؤنڈ سے باہر نکل کر زاویار کالج کے پچھلے احاطے کی طرف جا رہا تھا جہاں فٹبال ٹیم کے لڑکے پہلے سے موجود تھے۔وہ لوگ ہاکی ٹیم اور خاص کر زاویار کی اس تذلیل کو دور سے دیکھ چکے تھے۔

"اوہ ہو...کیپٹن صاحب تو میچ سے پہلے ہی آؤٹ ہوگئے۔"فٹبال ٹیم کے سینئر کھلاڑی نے طنزیہ قہقہہ لگایا۔" لگتا ہے نئے کوچ نے کیپٹن صاحب کو ان کی اصل اوقات دکھادی ہے۔"

"اب ہاکی کیپٹن گراؤنڈ کے باہر بیٹھ کر مٹی چاٹیں گے۔"دوسرے نے آواز کسی۔

زاویار جو پہلے ہی بارود کا ڈھیر بنا ہوا تھا،ان طعنوں پر اپنا ضبط کھو بیٹھا۔اس نے مٹھیاں بھینچیں اور اس لڑکے پر جھپٹ پڑا۔اس کا ایک زوردار گھونسا فٹبال فام کھلاڑی کے چہرے پر لگا۔وہ لڑکا لڑکھڑا کر پیچھے گرا۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی!"فٹبال ٹیم کے باقی لڑکے یکلخت طیش میں آگئے۔وہ تعداد میں سات آٹھ تھے جبکہ زاویار بالکل اکیلا تھا۔وہ سب کے سب ایک ساتھ زاویار پر ٹوٹ پڑے۔زاویار نے مقابلے کی کوشش کی مگر وہ اس کی پیٹھ پر سوار ہوگئے اور اسے نیچے گرا کر مارنے لگے۔ زاویار زمین پر گرا ان کے پے در پے وار سہتا ہوا بے بس ہو رہا تھا۔

"بریک اٹ...!!!" (Break it) ایک گرجدار آواز سنائی دی۔

اس سے پہلے کہ فٹبال ٹیم کے لڑکے مڑ کر دیکھتے،سقراط ان کے درمیان داخل ہوا۔ اس نے ایک ہی جھٹکے سے دو لڑکوں کو کھینچ کر دور پھینکا۔ سامنے موجود مخالف فٹبال ٹیم کا مین غنڈہ صفت کھلاڑی جیسے ہی آگے بڑھا،سقراط نے ہوا میں اپنا دایاں ہاتھ لہرایا اور ایک ہولناک گھونسا سیدھا اس کی ناک پر رسید کر دیا۔ہڈی ٹوٹنے کی واضح اور ہولناک آواز آئی۔اس کھلاڑی کے نتھنوں سے خون کا فوارہ چھوٹا اور وہ چکرا کر سیدھا پتھریلے فرش پر جا گرا۔باقی لڑکے یہ خوفناک منظر دیکھ کر وہیں منجمد ہوگئے۔سقراط نے جھک کر زاویار کا ہاتھ پکڑا اور اسے ایک ہی جھٹکے سے زمین سے اٹھا کر اپنے پیچھے کھڑا کر لیا۔اس نے جلتی ہوئی نظریں فٹبال ٹیم کے باقی لڑکوں پر ڈالیں اور ان کی طرف ایک قدم آگے بڑھایا۔

"آئندہ..."اس نے انگلی اٹھائی۔ "آئندہ اگر قادری کالج کے کسی بھی لونڈے نے میری ٹیم کے کسی ایک کھلاڑی کو چھونے کی بھی جرأت کی تو میں صرف ناک نہیں، اس کے دونوں ہاتھ توڑوں گا۔ یہ میری ٹیم ہے، اور ان پر پہلا اور آخری حق میرا ہے۔"

فٹبال ٹیم کے لڑکے اپنے زخمی ساتھی کو اٹھا کر وہاں سے ایسے بھاگے جیسے انہوں نے سامنے موت کا فرشتہ دیکھ لیا ہو۔ احاطے میں اب خاموشی تھی۔ ہاکی ٹیم کے باقی کھلاڑی بھی پریکٹس چھوڑ کر وہاں جمع ہو چکے تھے اور انہوں نے اپنی آنکھوں سے سقراط کا یہ روپ دیکھا تھا۔ زاویار نے اپنی شرٹ سے مٹی جھاڑی۔ اس کا پورا وجود حیرت، شرمندگی اور غصے سے لرز رہا تھا۔

"سوری کوچ...وہ...میں..." وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر سقراط ایک غضب ناک نظر اس پر ڈال کر بھاری قدم اٹھاتا وہاں سے نکلتا چلا گیا۔ پوری ہاکی ٹیم سناٹوں کی زد میں وہیں کھڑی رہ گئی۔

اور پھر چار گھنٹے بعد کالج کے پرنسپل آفس کا ماحول اس وقت کسی عدالت کا منظر پیش کر رہا تھا جہاں میز کے پیچھے قادری صاحب غصے سے لال چہرہ لیے بیٹھے تھے۔ ان کے دائیں اور بائیں جانب کالج بورڈ کے تین بااثر اور سوٹوں میں ملبوس ممبرز انتہائی سخت چہروں کے ساتھ موجود تھے۔ کمرے کے ایک کونے میں فٹبال ٹیم کا وہ لڑکا کھڑا تھا جس کی ناک پر سقراط کا مہیب گھونسا لگا تھا۔ اس کی ناک پر سفید پٹی بندھی تھی جس سے خون کے دھبے واضح تھے اور وہ بار بار درد سے کراہتے ہوئے اپنی مظلومیت کا رونا رو رہا تھا۔ اس کے ساتھ فٹبال ٹیم کا کوچ تھا جو سقراط کے خلاف کافی شہر اگل چکا تھا۔ میز کی دوسری طرف زاویار کھڑا تھا، اس کی شرٹ کی آستینیں خون سے اٹی ہوئی تھیں اور اس کا نیچے والا ہونٹ پھٹا ہوا تھا جہاں سے اب بھی ہلکا سا خون رس رہا تھا مگر اس کی نظریں سامنے کھڑے اس شخص پر جمی تھیں جو اس پورے طوفان کا مرکز تھا۔ سقراط شبگیر بالکل پرسکون، دونوں ہاتھ سینے پر باندھے سیدھا کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف یا پشیمانی کا دور دور تک کوئی نام و نشان نہیں تھا۔

"مسٹر سقراط! یہ ناقابل برداشت ہے۔" پرنسپل نے غصے سے میز پر ہاتھ مارا۔

"آپ پاکستان سے باہر ایک اچھے کوچ رہے ہوں گے مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ آپ کالج کے اسٹوڈنٹس پر یوں وحشیانہ حملہ کر دیں۔ آپ نے اس لڑکے کی ناک کی ہڈی توڑ دی ہے!"

بورڈ کے ایک معمر ممبر نے عینک درست کرتے ہوئے سخت لہجے میں کہا، "ایک کوچ کا کام لڑکوں کو ڈسپلن سکھانا ہوتا ہے، ان ہڈیوں کو توڑنا نہیں۔ آپ کے پاس اس بربریت کا کیا جواز ہے؟"

سقراط نے انتہائی اطمینان سے اپنی گہری نظریں اس بورڈ ممبر پر ٹکائیں اور حد درجہ سپاٹ، سرد لہجے میں بولا۔

"بربریت؟ آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے تو اسے بہت ہلکے سے چھوا تھا۔"

"چھوا تھا؟" پرنسپل حیرت اور غصے کے ملے جلے تاثرات سے تقریباً چیخ اٹھے۔ "مسٹر سقراط، وہ اسٹوڈنٹ سامنے کھڑا ہے، اس کی ناک کی ہڈی کے دو ٹکڑے ہو چکے ہیں۔ اگر آپ نے صرف چھوا تھا، تو چھونے پر ناک کیسے ٹوٹ گیا؟"

"یہ تو اب اس کی ناک سے ہی پوچھنا پڑے گا۔"

کمرے میں موجود بورڈ ممبرز سقراط کی اس بے نیازی اور طنزیہ جواب پر تلملا اٹھے۔

"مسٹر سقراط! اپنی زبان کو لگام دیں، آپ بورڈ کے سامنے کھڑے ہیں۔" دوسرے ممبر نے غصے سے کہا۔

لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات پوری کرتا، سقراط ایک قدم آگے بڑھا۔ اس نے اپنے پیچھے کھڑے زاویار کی طرف اشارہ کیا جس کا ہونٹ پھٹا ہوا تھا۔

"اور آپ لوگ کس بورڈ کی بات کر رہے ہیں؟ آپ کو اس لڑکے کا ٹوٹا ہوا ناک نظر آ رہا ہے مگر میری ٹیم کے کیپٹن کا یہ پھٹا ہوا ہونٹ نظر نہیں آ رہا؟ اور اگر وہ سات آٹھ لڑکے مل کر میری ٹیم کے کیپٹن کو بے طرح زخمی کر دیتے تو؟ اگلے مہینے ٹورنامنٹس ہیں، اگر اسے کچھ ہو جاتا تو اس کا ذمہ دار کون ہوتا؟ آپ؟ یا یہ بورڈ؟"

سقراط کا یہ رخ دیکھ کر پورا کمرہ چند سیکنڈز کے لیے سانپ سونگھ جانے کی کیفیت میں آ گیا۔ کسی میں اس کے اس سوال کا جواب دینے کی ہمت نہیں تھی۔ زاویار نے، جو اب تک خاموش کھڑا تھا ایک ایک گہرا سانس لیا، ایک قدم آگے بڑھا اور پرنسپل کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"سر!اس سب میں کوچ کی کوئی غلطی نہیں ہے۔ یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔ میں پریکٹس کے لیے لیٹ آیا تھا اور فیلڈ سے باہر جانے پر فٹبال ٹیم کے لڑکوں نے مُجھے طعنے دیے جس پر لڑائی میں نے شروع کی تھی۔ غلطی میری ہے، کوچ کی نہیں۔ انہوں نے صرف مُجھے بچایا ہے۔"

پرنسپل نے زاویار کو دیکھا اور پھر کچھ دیر بورڈ ممبرز کے ساتھ سرگوشی کی اور پھر حتمی فیصلہ سنانے کے لیے اپنا گلا صاف کیا۔

"ٹھیک ہے۔ چونکہ یہاں دونوں طرف سے ڈسپلن کی خلاف ورزی ہوئی ہے، اس لیے بورڈ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ ان تمام اسٹوڈنٹس کو جو اس لڑائی میں شامل تھے، تین دن کے لیے کالج سے سسپینڈ کیا جاتا ہے۔"

پرنسپل نے پھر سقراط کی طرف دیکھا، جس کے چہرے پر اب بھی کوئی تاثر نہیں تھا۔

"اور مسٹر سقراط! قانون ہاتھ میں لینے اور اسٹوڈنٹ کو زخمی کرنے کے جرم میں، آپ کو بھی تین دن کے لیے کو چنگ سے سسپینڈ کیا جاتا ہے۔ ان تین دنوں میں آپ کالج کی حدود میں داخل نہیں ہو سکتے۔"

سقراط نے یہ فیصلہ سنا مگر اس کے چہرے کے تاثرات میں ذرا برابر بھی تبدیلی نہیں آئی۔ اس نے نہ تو کوئی اعتراض کیا اور نہ ہی کوئی معذرت۔ وہ نے پرنسپل یا بورڈ کو الوداع کہے بغیر، بے نیازی باہر کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے زاویار کی طرف دیکھا تک نہیں، اس سے کوئی بات کیے بنا وہ آفس کا بھاری دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ کوریڈور میں قدم رکھتے ہی، سقراط نے میز پر رکھی اپنی ہاکی اسٹک اٹھائی بھاری بوٹوں کی تھاپ کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ کالج کا مین کوریڈور اس وقت اسٹوڈنٹس سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا جو پرنسپل آفس کے فیصلے کا انتظار کر رہے تھے۔ جیسے ہی سقراط باہر نکلا، اس کے کندھے پر رکھی ہاکی اور اس کی بے خوفی دیکھ کر پورے کوریڈور میں سکوت طاری ہو گیا۔ لڑکے خود بخود دائیں اور بائیں ہٹ کر اس کے لیے راستہ چھوڑنے لگے۔ پورا کالج جان چکا تھا کہ یہ شخص کوئی عام کوچ نہیں تھا۔ اب پورے کالج کا کوئی بھی اسٹوڈنٹ کم از کم دوبارہ اس سے کسی قسم کا پنگا لینے کی جرات نہیں کرنے والا تھا۔ سقراط شبگیر کالج کے مرکزی گیٹ سے باہر نکل گیا مگر اپنی دھاک ہمیشہ کے لیے اس کی دیواروں میں چھوڑ گیا۔

☆...☆...☆

بزدار پیلس کے سنگِ مرمر سے تراشے گئے ٹیرس پر شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ دور افق پر ڈوبتے سورج کی سرخ اور نارنجی لکیریں محل کی بلند و بالا دیواروں پر ایک اداس سا رنگ بکھیر رہی تھیں۔ پرتعیش لیونڈر کی مہک فضا میں رچی ہوئی تھی، جہاں آٹھ نشستوں والی شیشے کی بڑی میز پر چائے کے شاہانہ لوازمات سجے تھے۔ خوبصورت برتنوں میں گرم چائے، نفیس پیسٹریز اور مہنگے سنیکس رکھے تھے مگر اس میز کے گرد چھایا ہوا سکوت کسی قبرستان جیسا تھا۔ میز کے ایک جانب شمس بزدار اور منیبہ بیگم روایتی وقار کے ساتھ بیٹھے تھے۔ شمس صاحب اپنے ہاتھ میں پکڑے چائے کے کپ کو آہستہ آہستہ چمچ سے ہلا رہے تھے اور ان کی سرد نظریں میز کے دوسری طرف جمی تھیں۔ وہاں ان کے دونوں بچے بیٹھے تھے۔ ثالث بالکل پرسکون انداز میں بیٹھا تھا۔ مگر اس کے برابر میں بیٹھی عالیہ کی حالت بالکل مختلف تھی۔ وہ اپنی نظریں جھکائے، دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو سختی سے آپس میں بھینچے بیٹھی تھی۔ ٹیرس کی ٹھنڈی ہوا کے باوجود اس کے ماتھے پر پسینے کی باریک بوندیں ابھر رہی تھیں۔

شمس بزدار نے چائے کا ایک گھونٹ لیا، کپ کو حد درجہ نفاست سے طشتری پر رکھا۔

"دوسری پوزیشن، عالیہ..." شمس بزدار کی آواز اتنی دھیمی اور سپاٹ تھی کہ عالیہ کا دل، گلا گھٹنے کے احساس سے تڑپ اٹھا۔ "شمس بزدار کی بیٹی، دوسرے نمبر پر آئی ہے۔ تم جانتی ہو اس کا کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی اور ہے جو تم سے بہتر ہے۔ کوئی اور ہے جو بزداروں سے آگے نکل گیا ہے۔"

"میں نے سمجھا دیا تھا۔ یہ اب مزید محنت کرے گی۔" منیبہ بیگم نے اپنی کلائی کا کڑا درست کرتے بات سنبھالنے کی کوشش کی مگر شمس بزدار کو آج بات کرنے کا موقع مل چکا تھا۔

"ہم نے تمہاری پسند اور تمہاری آسائشوں پر کروڑوں روپے پانی کی طرح بہائے ہیں۔ اس محل میں کبھی کسی کو دوسرے نمبر پر آنے کی عادت نہیں رہی۔ تمہارا یہ رزلٹ ہمارے لیے فخر نہیں، ایک شرمندگی ہے۔"

عالیہ نے کچھ نہیں کہا۔ اس کا اندرونی وجود اس وقت ایک مہیب کرب کی گرفت میں تھا۔ وہ پچھلے کئی سالوں سے راتوں کو جاگی تھی، اس نے اپنی نیندیں، اپنی خوشیاں، اپنی پوری نوعمری ان کتابوں کے نام کر دی تھی۔ اس نے نوے فیصد سے زیادہ مارکس لیے تھے مگر اس اشرافیہ کے زعم میں اس کی یہ قربانی صرف اس لیے مٹی میں مل گئی کیونکہ کوئی چند نمبروں سے اس سے آگے نکل گیا تھا۔ اس کے حلق میں آنسوؤں کا ایک تپتا ہوا گولہ پھنس چکا تھا مگر وہ رو نہیں سکتی تھی۔ بزدار پیلس میں کمزوری دکھانا سب سے بڑا گناہ تھا۔

"پاپا! یہ ناانصافی ہے۔" ثالث سے عالیہ کی یہ خاموش تڑپ مزید دیکھی نہیں گئی۔اس نے اپنا کپ میز پر تقریباً پٹخا اور کھل کر عالیہ کی حمایت میں سامنے آیا۔"عالیہ نے دن رات ایک کیا تھا۔سیکنڈ پوزیشن لانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔آپ اس کی تعریف کرنے کے بجائے اسے ذہنی طور پر ٹارچر کررہے ہیں!"

"ثالث! اپنی زبان کو لگام دو اور بڑوں کے معاملے میں مت بولو۔"منیبہ نے سخت لہجے میں اپنے بیٹے کو ٹوکا۔شمس بزدار نے ایک سرد نظر ثالث پر ڈالی۔

"تمہاری رپورٹس بھی ملتی رہتی ہیں مُجھے ...تمہارا دھیان آج کل پریکٹس پہ کم، کہیں اور زیادہ ہے۔"

بات ایسی تھی کہ ثالث بھی پل بھر کو خاموش ہونے پر مجبور ہو گیا پھر شمس بزدار نے دوبارہ عالیہ کے زرد پڑتے چہرے کو دیکھا۔عالیہ نے اپنے کانپتے ہوئے اعصاب کو اکٹھا کیا۔اس کا اندرونی وجود بری طرح چیخ رہا تھا مگر اس کے لبوں سے صرف چند الفاظ نکلے۔

"میں ...میں اگلی بار اس سے بھی زیادہ محنت کروں گی، میں آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔میں فرسٹ پوزیشن لے کر آؤں گی۔"

شمس بزدار عالیہ کے اس جواب پر مطمئن نہیں ہوئے۔وہ آہستہ سے اپنی کرسی پر پیچھے کو ہوئے اور لہجے کو نرم رکھنے کی کوشش کی۔

"میں تمہیں صرف فرسٹ پوزیشن پر نہیں دیکھنا چاہتا، عالیہ۔میں تمہیں وہاں دیکھنا چاہتا ہوں جہاں اس وقت نجف ہے۔اگلے دس سالوں میں تمہیں بزدار ہسپتال کی چیف میڈیکل آفیسر بننا ہے، عالیہ! مُجھے مایوس مت کرنا۔"

یہ جملہ سماعت سے ٹکراتے ہی عالیہ کے نازک کندھوں پر جیسے پورے بزدار پیلس کا بوجھ آ گرا۔اس کا دم گھٹنے لگا۔نجف...ڈاکٹر نجف بزدار! وہ عورت جو اس خاندان کا وہ معیار بن چکی تھی جسے چھونا عام انسان کے بس کی بات نہیں تھی۔شمس بزدار اپنی بیٹی کو ایک مہرے کی طرح نجف کے متبادل کے طور پر تیار کررہے تھے تاکہ بورڈ اور ہسپتال کے اثاثوں پر ان کا کنٹرول مضبوط رہے۔عالیہ کو لگا کہ اس کی اپنی ذات، اس کے اپنے خواب، اس کی اپنی مسکراہٹیں سب اس ایک جملے کی نذر ہو چکے تھے۔اگلے دس سالوں کا خاکہ اس کے باپ نے اس کی روح پر لکھ دیا تھا۔شام کا اندھیرا اب پوری طرح ٹیرس پر اتر چکا تھا اور چائے کی میز پر موجود چاندی کے برتن سرد ہو رہے تھے بالکل عالیہ کے اندر کی

زندگی کی طرح۔وہ وہاں بیٹھی تھی مگراس کا وجوداس مہیب بوجھ تلے ہمیشہ کے لیے دب چکا تھا۔

☆...☆...☆

سیاہ لگژری کار سنسان سڑک کے کنارے،ایک ویران اور قدیم عمارت کے سامنے آ کر رک گئی۔فضا میں شام کا سرمئی اندھیرا زہریلی دھند کی طرح پھیلا ہوا تھا۔نجف نے چند لمحے گم صم بیٹھے رہنے کے بعد کار کا شیشہ نیچے کیا۔باہر کا منظر حد درجہ پراسرار تھا۔سامنے کھڑی عمارت کا بڑا حصہ جلا ہوا تھا،جس کے سیاہ ستون اور جلی ہوئی کھڑکیاں ماضی کے کسی ہولناک حادثے کا پتہ دے رہی تھیں۔عمارت کا بڑا لوہے کا گیٹ بند تھا۔نجف نے کئی طویل لمحوں تک اس جلی ہوئی عمارت کو گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے دیکھا پھر،ایک گہرا سانس لے کر اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔وہ گاڑی سے باہر نکل آئی۔اس نے جرسی کی ایک لمبی،گہرے رنگ کی فراک پہن رکھی تھی جو اس کے ٹخنوں کو چھو رہی تھی۔ایک گرم مفلر اس کی گردن کے گرد نفاست سے لپٹا ہوا تھا جبکہ اس کے بال ایک جانب کی مانگ نکالے،اس کے شانوں پر کھلے بکھرے ہوئے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ،نپے تلے قدموں سے اس زنگ آلود گیٹ کی طرف بڑھی۔قریب پہنچ کر اس نے ہاتھ بڑھا کر بھاری گیٹ کو دھکیلا۔گیٹ ایک چڑچڑاتی ہوئی آواز کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔نجف نے دھڑکتے دل پر قابو پا کر اندر قدم رکھا۔آج اس کی زندگی کا ایک بڑا راز یہاں سے افشاں ہونے والا تھا۔عمارت کے اندرونی حصے میں اس وقت ہولناک،دم گھونٹ دینے والا سناٹا راج کر رہا تھا۔ہوا میں راکھ اور پرانی لکڑی کے جلنے کی بو جیسے اب بھی باقی تھی۔نجف کے کورٹ شوز کی نوکیلی آواز اس ویران فرش پر پڑ رہی تھی جو اس خاموشی میں دگنی ہو کر گونج رہی تھی۔ٹک...ٹک...ٹک...!اس کا اپنا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا مگر وہ قدم آگے بڑھاتی گئی۔راہداری کی سیاہی اسے اپنے اندر نگلنے کے لیے تیار تھی۔وہ اندر سے بے طرح خوفزدہ تھی مگر پھر بھی انجانی کشش کے تحت آگے بڑھتی جا رہی تھی۔

"ہیلو؟ کوئی ہے..." نجف کی آواز اس سنسان ماحول میں لرزتی ہوئی ابھری مگر جواب میں صرف اس کی اپنی آواز کی بازگشت پلٹ کر آئی۔وہ جوں جوں آگے بڑھ رہی تھی اس کے اندر کا خوف گہرا ہوتا جا رہا تھا۔اور پھر...اچانک اسے اپنے پیچھے قدموں کا احساس ہوا۔کوئی اس کے عین پیچھے چل رہا تھا۔ایک دھیمی،گھسیٹتی ہوئی چاپ فضا میں ابھری۔وہ ٹھہر گئی۔اس کا خون رگوں میں جمنے لگا۔اس نے جھٹکے سے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔وہاں کوئی نہیں تھا۔صرف کالی،لرزتی ہوئی پرچھائیاں تھیں۔وہ ابھی سانس بحال بھی نہیں کر پائی تھی کہ بالکل اس کے عقب میں ہولناک ہنسی کی آواز ابھری۔وہ ایک ایسی آواز تھی جس کا کوئی جنس نہیں تھا۔وہ نہ تو کسی عورت کی تھی اور نہ ہی کسی مرد کی بلکہ دونوں کا ایک ایسا بھیانک امتزاج تھی جو روح کو کپکپا دے۔خوف کی زنجیروں نے نجف کو اپنی لپیٹ میں لیا۔وہ جھٹکے سے پلٹی مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔

" کون ہو تم؟ سامنے آؤ..." اسکا وجود لرز رہا تھا مگر وہ اپنی قوت جمع کرتے زور سے چلائی اور اسکے ساتھ ہی بھیانک قہقہوں کی آوازوں کا

سلسلہ بندھ گیا۔ایک نہیں کئی ساری آوازیں...نجف کا چہرہ فق ہوگیا۔اس نے اپنے کپکپاتے قدموں کوموڑااور پاگلوں کی طرح راہداری کے باہر کی طرف بھاگنا شروع کیا۔اس کے کورٹ شوز کی آواز اب افراتفری کا شکار تھی۔لیکن اس سے پہلے کہ وہ مرکزی دروازے تک پہنچ پاتی،اندھیرے سے ایک سیاہ وجود نکل آیا۔دو مضبوط ہاتھوں نے پیچھے سے اسے دبوچ لیا۔

"چھوڑو مُجھے ...چھوڑو..." وہ اپنے وجود کی پوری طاقت سے چلائی مگر اس وجود کی گرفت لوہے کی طرح سخت تھی۔

"چھوڑو..." اسکے گردن کی نسیں ابھر آئیں۔اسکا دل پھٹنے کو تیار تھا۔مگر اس وجود نے نجف کو ہوا میں لہرایا اور پوری طاقت سے پتھریلے،سرد فرش پر پٹخ دیا۔نجف کا ماتھا سیدھا فرش سے ٹکرایا۔ایک تڑپا دینے والا درد اس کے سر سے ہوتا ہوا پوری ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گیا۔اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر ناکام ٹھہری۔وہ بے بسی سے فرش پر پڑی تھی جب اس وجود نے اسے بالوں سے پکڑ کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔اس کے چہرے کے بالکل قریب وہی ہولناک، بے جنس آواز دوبارہ گونجی۔

" کہا تھا نا ملکانی...میری جگہ چھوڑ دے..."

نجف نے بائیں ہاتھ سے فرش کو کھرچتے ہوئے دوبارہ بھاگنے کی کوشش کی مگر اس سائے نے اس پر رحم نہیں کھایا۔اس نے نجف پر انتہائی بے رحمی سے تشدد کرنا شروع کیا،وہ اسے بے طرح مار رہا تھا اور پھر اپنے دونوں تپتے ہوئے کالے ہاتھ نجف کی گردن پر جما دیے۔گلا دبتے ہی نجف کی سانسیں رک گئیں۔اس کی رنگت نیلی پڑنے لگی،آنکھیں باہر کو ابلنے لگیں...اسکے جسم سے جان نکل رہی تھی۔وہ ہوش کھو رہی تھی اور پھر اندھیرا چھا گیا اور اسکے ساتھ ہی نجف ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔اس کی ہچکی بندھ چکی تھی اور وہ پاگلوں کی طرح ہوا کو اپنے اندر کھینچنے کی کوشش کر رہی تھی۔وہ کسی ویران عمارت میں نہیں بلکہ ہسپتال کے پرسکون کمرے میں اپنے کاؤچ پر موجود تھی۔
کھڑکی سے دن کی تیز روشنی اندر آ رہی تھی۔اس کا پورا وجود پسینے سے بری طرح نہایا ہوا تھا یہاں تک کہ اس کے کھلے بال اس کے گالوں اور گردن پر چپک چکے تھے۔اس کی حالت اس وقت حد درجہ خراب تھی۔اس کے پورے جسم میں ایسا درد ہو رہا تھا جیسے واقعی اس پر کسی نے بے طرح تشدد کیا ہو۔ اس کے ہاتھ اور انگلیاں اس طرح کانپ رہی تھیں جیسے وہ ان پر سے اپنا کنٹرول کھو چکی ہو۔اس نے کانپتے ہاتھوں سے اپنی گردن کو چھوا، جہاں اب بھی اس گرفت کا لمس محسوس ہو رہا تھا۔خواب کا وہ خوفناک سحر ابھی تک اس کے اعصاب پر سوار تھا۔اسی لمحے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔نجف ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔اس نے اپنے بالوں کو سمیٹا اور میز کے دروازے میں رکھا کیچر نکال کر بالوں کو باندھ لیا۔ٹشو نکال کر اپنے چہرے کو اچھے سے پونچھا اور پھر متوازن لہجے میں کم ان کہا۔کمرے کا بھاری دروازہ ایک دھیمی سی

آواز کے ساتھ کھلا۔ نجف کا پرسنل اسسٹنٹ عمر فائلز ہاتھ میں لیے اندر داخل ہوا۔

"ہیلو ڈاکٹر! آپ نے کہا تھا یاد دلا دوں، آج آپ کو ایک اہم فنکشن اٹینڈ کرنا ہے۔" عمر نے انتہائی پیشہ ورانہ لہجے میں یاد دلایا۔

" کوئی اپائنٹمنٹ تو نہیں ہے؟" نجف اب اپنا بیگ سمیٹ رہی تھی۔

"نہیں سب کلیئر ہے۔" عمر نے سنجیدگی سے کہا۔

"ٹھیک ہے پھر..." نجف نے بیگ اٹھا کر عمر کو دیکھا۔ ایک دھیمی مسکراہٹ اسکے چہرے پر ابھری۔ وہ جانے کے لیے تیار تھی۔ عمر نے راستہ دیا اور نجف دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ عمر خاموشی سے اس کے پیچھے باہر نکلا۔ راہداری میں چلتی ہوئے نجف اب اسے چند ہدایات کر رہی تھی پھر وہ اسے وہیں چھوڑ کر باہر نکل آئی۔ ہسپتال کے پارکنگ لاٹ میں کھڑی گاڑی کے اندر اب وہ اکیلی بیٹھی تھی۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ تو کر دی تھی مگر اس کے ہاتھ اسٹیرنگ ویل پر جمے ہوئے تھے۔ وہ کئی طویل لمحوں تک بالکل ساکت بیٹھی سامنے ڈیش بورڈ کو تکتی رہی۔ اس نے اپنی اکتیس سالہ زندگی میں آج تک اتنا بھیانک اور حقیقت سے قریب تر خواب کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ گلے پر پڑنے والے اس غیر مرئی لمس کی تپش اور اس عجیب، بے جنس آواز کو اپنے اعصاب سے کھرچ پھینکنا چاہتی تھی مگر وہ لمس اسکی گردن پہ انگارہ بن چکا تھا۔ اس نے سیٹ سے ٹیک لگائی، آنکھیں بند کیں اور آہستہ آہستہ لمبے، گہرے سانس لیتے ہوئے خود کو ریلیکس کرنے کی کوشش کی۔ دل کی دھڑکن اب کچھ حد تک اپنے نارمل ردھم پر واپس آ رہی تھی۔ پھر وہ سیدھی ہوئی، بائیں کلائی اٹھا کر گھڑی پر وقت دیکھا۔ شام کے چار بج رہے تھے۔

"مُجھے اب نکلنا چاہیے..." اس نے خود کلامی کی۔

آج کا دن اس کے لیے بہت مصروف اور اہم تھا۔ آج نیمل کی مہندی اور نکاح تھا۔ دونوں تقریبات ایک ساتھ رکھی گئی تھیں جبکہ رخصتی کل ہونی تھی۔ نجف نے نیمل سے وعدہ کیا تھا کہ وہ دنیا کے تمام کام چھوڑ کر اس کے نکاح کی تقریب میں ضرور شامل ہوگی۔ اسی اہم وعدے کو یاد کرتے ہوئے اس نے خواب کے خوفناک سائے کو ذہن کے کسی پچھلے خانے میں دھکیلا، گاڑی کو گیئر میں ڈالا اور شاپنگ کے لیے نکل پڑی۔ دس منٹ بعد وہ مال کے سامنے تھی۔ شہر کا سب سے بڑا اور پر تعیش شاپنگ مال اس وقت خریداروں کی گہما گہمی سے گونج رہا تھا۔ چمکتی ہوئی لائٹس، برانڈز کے خوبصورت ڈسپلے اور لوگوں کے قہقہے... یہ سب کچھ اس اندھیری راہداری اور جلی ہوئی عمارت کے بالکل برعکس تھا

جہاں نجف چند منٹ پہلے خود کو تڑپتا ہوا دیکھ آئی تھی۔اس ماحول نے اسے کافی حد تک پرسکون کر دیا۔وہ سب سے پہلے ایک انٹرنیشنل جیولری آؤٹ لیٹ پر گئی۔وہاں سے اس نے حد درجہ نفیس زیور خریدے۔مزید شاپنگ کی اور پھر شاپنگ بیگز ہاتھ میں تھامے، وہ مال کی راہداری میں آگے بڑھ رہی تھی جب اچانک ایک موڑ مڑتے ہی اس کے قدم وہیں پتھر کے ہو گئے...اس کے ہاتھ کی گرفت اتنی ڈھیلی ہوئی کہ قیمتی گفٹس اور شاپنگ بیگز اس کے ہاتھوں سے گرتے گرتے بچے۔اس کا پورا وجود منجمد ہو گیا، آنکھیں خوف اور حیرت کے ایک جھٹکے سے پھیل گئیں۔اس کے عین سامنے چمکتے ہوئے شیشے کے پار، ایک بے چہرہ مانیوکن کھڑی تھی۔اور اس مانیوکن پر جو لباس لٹک رہا تھا...وہ کوئی عام لباس نہیں تھا۔وہ وہی جرسی کی لمبی فراک تھی جو اس نے ابھی چند منٹ پہلے اپنے خواب میں پہنے ہوئی دیکھی تھی۔وہی مخصوص اونی کپڑا... وہی ہولناک حد تک مانوس رنگ...اور اس کے گرد بالکل اسی انداز میں لپٹا ہوا وہ گرم مفلر! لباس کا ایک ایک ٹانکا، اس کا فلو اور اس کا وجود بالکل وہی تھا جس کے دامن کو تھامے وہ اس جلی ہوئی عمارت میں موت کی پناہ مانگ رہی تھی۔

نجف پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس شیشے کے پار لٹکتے کفن جیسے لباس کو تک رہی تھی۔ایک پل کو لگا جیسے وقت تھم گیا ہے اور وہ مال کے شور سے کٹ کر دوبارہ اسی خواب کے اندھیرے میں جا گری۔ اس کے پسلیوں کے پیچھے موجود دل ایک بار پھر بے ترتیبی سے دھڑکنے لگا۔وہ اس سحر میں اتنی کھو چکی تھی کہ اسے اپنے آس پاس کا کوئی ہوش نہیں رہا۔وہ ایک جھٹکے سے ہوش کی دنیا میں لوٹی جب دوسری جانب سے بھاگتا ہوا ایک چھوٹا بچہ اچانک اس کے گھٹنوں سے زور سے ٹکرایا بچے کی ماں نے شرمندگی سے نجف سے معذرت کی اور بچے کو لے کر آگے بڑھ گئی۔

نجف نے اپنی اکھڑتی ہوئی سانسوں کو بحال کیا اوشاپنگ بیگز کو مضبوطی سے تھام لیا۔اس کا دماغ اسے چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ یہ محض ایک اتفاق ہے، ایک نفسیاتی وہم ہے۔لیکن اس کے اندر جاگتی ہوئی ماورائی کشش اسے لباس کی طرف کھینچ رہی تھی۔اور پھر وہ نپے تلے مگر تیز قدموں سے اس آؤٹ لیٹ کے اندر داخل ہوئی۔اس نے سیدھا سیلز گرل کی طرف رخ کیا اور اس مانیوکن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"مُجھے یہ ڈریس چاہیے..."

"سائز میڈم؟" سیلز گرل نے شائستگی سے پوچھا۔

"میڈیم..." وہ مسکرا بھی نہ پائی۔کچھ ہی منٹوں میں وہ فراک ایک سیاہ لگژری بیگ میں پیک ہو کر نجف کے ہاتھ میں تھی۔اس خواب کی ہولناکی اور اس ڈریس کے یوں اچانک سامنے آجانے نے نجف کو اندر سے بے تحاشا پریشان اور مضطرب کر دیا تھا، مگر جانے کیوں...اس کے اندر کے کسی قابل بھروسہ شخص نے اسے مجبور کیا تھا کہ وہ اسے خرید لے۔جیسے وہ لباس اس کی تقدیر کا کوئی ادھورا حصہ تھا جو اسے ہر قیمت پر اپنے پاس رکھنا تھا۔وہ مال کے ایگزٹ کی طرف بڑھ رہی تھی مگر اب اس کے ہاتھ میں موجود سیاہ بیگ اسے قیمتی تحائف سے کہیں زیادہ

بھاری محسوس ہو رہا تھا۔

☆...☆...☆

شہر کا پر تعیش اور وسیع بینکوئٹ ہال اس وقت روشنیوں اور خوشبوؤں کے سحر انگیز طوفان میں ڈوبا ہوا تھا۔ چونکہ آج نیمل کی مہندی اور نکاح کی تقریبات ایک ہی دن یکجا تھیں، اس لیے ہال کی تزئین و آرائش میں روایتی رنگوں کے ساتھ ساتھ سفید گلاب، چاندی کے تاروں اور صندل کی دھیمی خوشبو کا ایک توازن برقرار رکھا گیا تھا۔ اسٹیج کو ایک خوبصورت خواب کی طرح سجایا گیا تھا جہاں شیشے کے فانوسوں کی مدہم روشنی فرش پر منعکس ہو رہی تھی۔

ہال کے مرکزی داخلی راستے پر سرمد صاحب اور زہرہ بیگم، آنے والے مہمانوں کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ سرمد صاحب کے چہرے پر جہاں ایک باپ کا فخر تھا، وہیں بوجھل اداسی بھی ان کی آنکھوں کے کناروں سے جھانک رہی تھی۔ زہرہ بیگم گہرے زری کے کام والے جوڑے میں ملبوس، ہر مہمان سے انتہائی گرمجوشی اور محبت سے مل رہی تھیں۔ وہ دونوں میاں بیوی ایک ساتھ پروقار لگ رہے تھے۔ پورے ہال کے انتظام کو مثالی بنانے میں دو وجود ایک تسلسل کے ساتھ متحرک تھے۔ سلال اور سقراط دونوں اس تقریب کے دو مضبوط ترین ستون بنے ہوئے تھے۔ سلال اپنی مخصوص نفیس مسکراہٹ کے ساتھ کیٹرنگ، لائٹس اور مہمانوں کے بیٹھنے کے پروٹوکول کو خود دیکھ رہا تھا جبکہ دوسری طرف سقراط کھانے کے انتظام کو پرفیکٹ بنا رہا تھا۔ ان دونوں کی موجودگی نے پورے ماحول کو پرسکون تحفظ دے رکھا تھا۔

ہال کے ایک آرام دہ کونے میں جہاں صوفے بچھے تھے، تارہ اور نوفہ دادی کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھی تھیں۔ کبھی وہ کسی بات پر زور سے ہنستیں اور کبھی تارہ اپنا کیمرہ اٹھا کر ویڈیو شوٹ کرنے لگ جاتی۔ وہ ہر طرح سے دلہن کی بہنیں لگ رہی تھیں۔ میز پر رکھے مہندی کے بڑے بڑے تھالوں کے بیچ چغلی خان چھوٹی سی گلابی قمیص پہنے بیٹھا تھا۔ "شادی...شادی...شادی..." وہ ہر چند منٹوں بعد راگ الاپنا شروع کر دیا تھا۔ اسکی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ دوسری جانب سکندر فیملی بیٹھی تھی۔ وردہ اور طالب... یوں تو طالب بھی کئی مقامات میں سلال کے ساتھ تھا مگر اس وقت وہ وردہ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اسکے چہرے پر عجیب سی سنجیدگی تھی۔ کبھی کبھی لگتا تھا جیسے وہ وہاں زبردستی بیٹھا ہو۔

"ویسے نامرہ اچھی لگ رہی ہے۔ تم کہو تو امی سے کہہ کر تمہاری بات چلاؤں؟" وردہ نے ایک نظر نامرہ کو دیکھتے ہوئے شرارت سے کہا۔ طالب کے کان تک سرخ پڑے۔

"تم بہت فضول بولتی ہو وردہ! وہ میرے لیے بہنوں جیسی ہے۔اور خدا کا واسطہ ہے امی سے ایسی کوئی بات مت کرنا۔" وہ خفا ہوا۔

"اچھا ٹھیک ہے نہیں کرتی..." وردہ نے منہ بنا کر رخ موڑ لیا۔اب وہ اپنا فون دیکھ رہی تھی جبکہ کچھ فاصلے پر ثریا چچی اپنے شوہر کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ان کے ساتھ آصفہ پھوپھو بھی تھیں۔وہ بار بار سلال کو دیکھ رہی تھیں۔ثریا چچی کو سلال پسند تھا۔ان کا بہت دل تھا کہ سرمد صاحب سلال کے لیے وردہ کو مانگ لیتے...اگر ایسا ہو جاتا تو پھر وہ طالب کے لیے نامرہ کا سوچ سکتی تھیں مگر جب خود کی بیٹی کو اتنی اہمیت نہیں ملی تو وہ کیوں ان کی بیٹیوں کو اہمیت دیں؟ پستہ رنگ کے گھیر دار لہنگے میں، نیمل کی کولیگ سے بات کرتی ہوئی نامرہ انہیں زہر لگی۔

"میری بڑی خواہش تھی سرمد بھائی کی ایک بیٹی ہمیں مل جاتی۔میں تو کہتا ہوں ابھی بھی سوچ لو..." سکندر چچا نے ثریا چچی کی جانب ذرا سا جھکتے ہوئے کہا۔

"آپ کو اپنی بیٹی نظر نہیں آ رہی؟ خبردار جو آپ نے سرمد بھائی سے ایسی کوئی بات کی۔پہلے وہ رشتہ مانگیں پھر ہم سوچیں گے ورنہ نہیں..." سکندر چچا گہری سانس لے کر رہ گئے۔سلال تو انہیں بھی پسند تھا مگر بیوی کی چرب زبانی سے تنگ تھے۔
باہر کی اس تمام گہما گہمی سے دور، ہال کے برائیڈل روم میں ایک الگ ہی دنیا آباد تھی۔وہاں چاروں طرف لگے آئینے اس حسن کو منعکس کر رہے تھے جو آج اپنی زندگی کے سب سے بڑے موڑ پر کھڑا تھا۔نیمل آئینے کے سامنے خاموش بیٹھی خود کو تک رہی تھی۔نکاح کی مناسبت سے اس نے حد درجہ نفیس اور ہلکے رنگ کا جوڑا منتخب کیا تھا۔وہ ہلکے پرپل اور سلور رنگ کے بھاری مگر خوبصورت لہنگے میں ملبوس تھی۔اس کے گلے اور ہاتھوں میں نفیس جیولری چمک رہی تھی، جبکہ اس کے گھنے، سیاہ بالوں کو کسی بناوٹ کے بغیر کمر پر کھلا چھوڑ دیا گیا تھا۔سر پہ دوپٹہ نفاست سے ٹکا تھا۔وہ اس رنگ کے لباس میں زمین پر اتری ہوئی کوئی اپسرا لگ رہی تھی۔ایک ایسی دلہن جس کا روپ دیکھنے والے کی سانسیں پل بھر کو روک دے۔اسی لمحے برائیڈل روم کا دروازہ کھلا اور نامرہ اندر داخل ہوئی۔اس کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔وہ مسکراتی ہوئی نیمل کے بالکل پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی۔

"شاہ زیب بھائی کے گھر والے پہنچنے والے ہیں۔" نامرہ نے نیمل کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے خوشی سے کہا۔مگر جیسے ہی اس نے آئینے میں نیمل کے چہرے کے تاثرات دیکھے، اس کی مسکراہٹ وہیں تھم گئی۔نامرہ، نیمل کے چہرے پر پھیلی اس گہری خاموش پریشانی کو ایک لمحے میں بھانپ چکی تھی۔نامرہ نے سامنے آتے ہوئے جھک کر نیمل کی سرد انگلیوں کو اپنے ہاتھ میں لیا۔

"تم پریشان ہو؟"

نیمل نے آئینے سے نظریں ہٹا کر نامرہ کو دیکھا۔ وہ اپنے روایتی رف حلیے کی نسبت آج بہت پیاری لگ رہی تھی۔ نیمل کی آنکھوں میں آنسوؤں کی ایک باریک سی لکیر ابھری، اس نے ایک بوجھل سانس لیا اور دھیمی آواز میں بولی۔

"میں خوفزدہ ہوں، نامرہ!"

"لیکن کیوں؟" نامرہ نے حیرت سے پوچھا۔ "شاہ زیب بھائی تم سے محبت کرتا ہے، سب کچھ اتنا پرفیکٹ ہے۔ پھر یہ خوف کیوں؟"

"شاید ہر لڑکی شادی سے پہلے خوفزدہ ہوتی ہے۔" نیمل کے لبوں سے ایک بے بس مسکراہٹ نکلی۔

"اور وہ کیوں ہوتی ہے؟" نامرہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا، وہ اس کے اندر کے طوفان کو سننا چاہتی تھی۔

نیمل نے اپنے لہنگے کے دامن کو انگلیوں میں بھینچ لیا، اس کا دل اس وقت ایک مشرقی لڑکی کے ان تمام ان کہے وسوسوں سے تڑپ رہا تھا جو صدیوں سے ہر دلہن کی روح کا بوجھ رہے ہیں۔ وہ چند لمحے خاموش رہی پھر دھیرے سے بولی۔

"مُجھے شادی سے نہیں، اس کے بعد والی زندگی سے ڈر لگ رہا ہے۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"ڈر ہے... کہیں مُجھے خود کو بدلنے پر مجبور نہ کر دیا جائے۔"

وہ ہلکا سا مسکرائی مگر وہ مسکراہٹ آنکھوں تک نہ پہنچ سکی۔ نامرہ سنجیدگی سے اسے دیکھے گئی۔

"آج سب کہتے ہیں تم جیسی ہو ویسی ہی اچھی ہو۔ اگر کل یہی لوگ کہیں... اب تمہیں بدلنا ہوگا... تو؟"

اس کی نظریں آئینے میں اپنے عکس پر جم گئیں۔

میں اپنے خواب چھوڑ سکتی ہوں کیا؟ اپنی پہچان؟ اپنی آزادی؟"

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس کی آواز اور مدھم ہو گئی۔

"اگر کبھی میرے کام پر اعتراض ہوا تو؟ اگر مُجھے کہا گیا کہ چار دیواری ہی میری دنیا ہے تو؟"

اس کی آنکھیں مزید نم ہوئیں۔

"اور اگر...اگر میرے والدین کے بارے میں ایک بھی ایسا لفظ کہہ دیا گیا جو ان کی عزت سے ٹکرا جائے...میں برداشت کیسے کروں گی؟"

اس نے لب بھینچ لیے۔

"مُجھے اپنے لیے اتنا خوف نہیں جتنا ان کے لیے ہے۔ میں نہیں چاہتی میری وجہ سے کبھی ان کا سر جھکے۔"

اس کی آواز بھرّا گئی۔

"یہ گھر... یہاں میں غلطی کرتی ہوں تو ڈانٹ بھی محبت لگتی ہے۔ وہاں؟ وہاں میری ایک غلطی میرا تعارف بن سکتی ہے۔"

نیمل کی پلکوں سے ایک آنسو ڈھلک کر اسکے رخسار پہ بہتا چلا گیا۔

"مُجھے ڈر ہے...کہیں مُجھے ہر وقت خود کو ثابت نہ کرنا پڑے۔"

اس نے نامرہ کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔

"اورسب سے بڑا ڈر جانتی ہو کیا ہے؟ کہیں ایک دن شاہ زیب بھی بدل نہ جائے۔"

"محبت جب ذمہ داریوں کے نیچے دبتی ہے نا...تو لوگ بھی بدل جاتے ہیں۔میں ایک گھر چھوڑ کر جا رہی ہوں لیکن صرف گھر نہیں چھوڑ رہی۔ میں اپنا کمرہ، اپنی عادتیں، اپنی پہچان، اپنے لوگ...سب پیچھے چھوڑ رہی ہوں۔"اس کی آواز ٹوٹ گئی۔
نامرہ کو کئی لمحے لگے نیمل کو خوفزدہ دیکھ کر پروسیس کرنے میں۔نیمل شبگیر کو اس نے پچھلے کئی سالوں سے چٹان کی طرح مضبوط دیکھا تھا مگر عورت کتنی ہی بہادر، کتنی کی مضبوط کیوں نہ ہو، اسکا اندر ہمیشہ خوفزدہ رہتا ہے۔

"نامرہ...مُجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں اپنی پوری زندگی سمیٹ کر ایک ایسے دروازے کے سامنے کھڑی ہوں...جس کے پار کیا ہے، مُجھے کچھ معلوم نہیں۔"

اس نے دھیرے سے اپنی انگلیوں پر لگی مہندی کو دیکھا۔

"سب کہتے ہیں شادی ہر لڑکی کا خواب ہوتی ہے...مگر کوئی یہ کیوں نہیں بتاتا کہ خوابوں سے زیادہ ڈر بھی اسی دن لگتا ہے؟ خوابوں سے بھی تو ڈرنا چاہیے نا؟" وہ ہلکا سا مسکرائی، مگر آنکھیں نم تھیں۔

"میں ڈر رہی ہوں...کہیں مُجھے خود کو کھونا نہ پڑ جائے۔اگر ایک دن مجھ سے کہا گیا کہ یہ مت پہنو...وہاں مت جاؤ...یہ کام چھوڑ دو...ایسے مت ہنسو...اتنا مت بولو...تو کیا میں آہستہ آہستہ وہ نیمل ہی نہیں رہوں گی جسے میرے گھر والے جانتے ہیں؟"

نیمل شبگیر تو ہمیشہ سے ہی مشکل تھی مگر آج اسکے سوال اتنے مشکل کیوں لگ رہے تھے۔نامرہ کے ہونٹ بھینچ گئے۔

"میں نے ہمیشہ اپنے خوابوں کے ساتھ جینا سیکھا ہے، نامرہ۔مُجھے ڈر لگتا ہے...کہیں شادی کے بعد مُجھے اپنے خوابوں سے دستبردار نہ ہونا پڑ جائے۔"

چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔نامرہ اپنے گھٹنے موڑے نیمل کے قدموں میں بیٹھی تھی اور اسکی جھولی میں رکھے دونوں ہاتھ تھام رکھے

تھے۔

"اوراگر...اگر میں سب کی توقعات پر پوری نہ اتر سکی تو؟اگر میں اچھی بہوثابت نہ ہوسکی؟اچھی بیوی نہ بن سکی؟اگر میری کوئی عادت کسی کو پسند نہ آئی تو؟اگر مجھے ایک دن امی کی گود چاہیے ہوئی...تو کیا ہوگا؟اگر مُجھے ابو کی آواز سن کر رونا آ گیا تو؟"وہ لب بھینچے بے اختیار رو دی۔

" کتنا عجیب ہے نا...ایک لڑکی جن لوگوں کے بغیر ایک دن نہیں گزار سکتی...شادی کے بعد انہی لوگوں کے گھر آنے کے لیے بھی اجازت لینی پڑتی ہے۔"

"آپی...."نامرہ کی آواز بھرا گئی۔

"میں صرف دلہن نہیں بن رہی...میں اپنی پوری زندگی نئے سرے سے شروع کرنے جا رہی ہوں۔اس لیے خوفزدہ ہوں۔"

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔نامرہ نے نیمل کے جذباتی بہاؤ کو دیکھا تو اس کا اپنا دل مزید بھر آیا۔اس کی آنکھوں کے گوشے بھی بھیگ گئے۔ وہ جانتی تھی کہ یہ صرف نیمل کا خوف نہیں تھا، یہ اس زمین پر رخصت ہونے والی ہر اس لڑکی کا کرب تھا جو اپنی ڈولی میں بیٹھنے سے پہلے اس احساسِ تنہائی سے گزرتی ہے۔نامرہ نے بغیر کچھ کہے، اٹھ کر نیمل کے ان لرزتے ہوئے شانوں کو اپنے حصار میں لے لیا۔وہ اس سے لپٹ گئی تھی۔کل سے وہ ان کے ساتھ نہیں رہے گی۔وہ دوسرے گھر چلی جائے گی یہ سوچ کر ہی نامرہ کو اب اپنی جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ جس بہن کو وہ سکول میں کسی سے بات بھی نہیں کرنے دیتی تھی...وہ بہن چند گھنٹوں کی مہمان تھی۔

"نیمل شبگیر، سرمد شبگیر کی بیٹی ہے۔نیمل کمزور نہیں ہوسکتی۔شاہ زیب بھائی آپ کی اس خودداری سے محبت کرتے ہیں۔وہ آپکا مان کبھی نہیں توڑیں گے۔"

نیمل نے اپنا سر نامرہ کے شانے پر ٹکا دیا اور خاموشی سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو نامرہ کے بالوں میں جذب ہونے دیا۔ جبکہ باہر ہال کے مرکزی دروازے پر لگی سنہری روشنیاں یکلخت آگے پیچھے رکنے والی دو مہنگی گاڑیوں پر چمکیں۔نجف باہر نکلی تھی اور اسکے ساتھ تین ملازم تھے جنہوں نے گاڑی سے کئی تحائف اور بڑے بڑے تھال نکالے تھے۔یونیفارم، سیاہ پینٹ اور سفید شرٹ، میں ملبوس ملازم نجف کے اشارے پر آگے بڑھ رہے تھے اور وہاں رکنے والے کئی افراد نے حیرت سے انہیں دیکھا تھا۔

نجف ہمیشہ کی طرح سرد اور دلفریب حسینہ لگ رہی تھی۔اس نے آسمانی رنگ کا نفیس جوڑا پہن رکھا تھا جس پر چاندی کے تاروں کا باریک، نایاب کام تھا جو اس کی شخصیت کی نفاست کو مزید نمایاں کر رہا تھا۔شہد رنگ بال نفاست سے جوڑے میں بندھے تھے۔استقبالیہ پہ کھڑی زہرہ بیگ کی نظر جیسے ہی نجف پر پڑی، ان کے بڑھتے ہوئے قدم وہیں منجمد ہو گئے، وہ جیسے ساکت رہ گئیں۔رشتہ سوتیلی بہن کا ہی تھا مگر زہرہ بیگم نے نجف کو ہمیشہ اپنے دل کے ٹکڑے کی طرح عزیز رکھا تھا۔نجف بھی ٹھٹک کر رکی۔دس سال گزر چکے تھے۔وہ دونوں دس سال بعد مل رہی تھیں۔شکوے شکایات سب کچھ دم توڑ گیا۔زہرہ بیگم کی آنکھیں یکلخت بھر آئیں اور وہ دامن سنبھالتی ہوئی تیزی سے نجف کی طرف بڑھیں۔

"نجف...میری بچی!"انہوں نے آگے بڑھ کر نجف کو خود سے لگا لیا اور ان کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔وہ نجف کے شانے پر سر رکھ کر بے اختیار سسک اٹھیں۔سالوں بعد اپنے خون کی مہک محسوس ہوئی تھی۔سالوں بعد 'مائیکے' سے کوئی آیا تھا۔

نجف کے چہرے کی سختی زہرہ بیگم کے اس مخلص لمس سے فوراً پگھل گئی۔اس نے اپنے نرم ہاتھ زہرہ بیگم کی پشت پر رکھے اور انہیں خود میں بھینچ لیا۔

"بہت دیر کر دی تم نے نجف...بہت انتظار کروایا تم نے...میری آنکھیں راہ تکتے تکتے پتھر ہو گئیں..."

آس پاس کے ماحول سے بے خبر زہرہ بیگم سسک رہی تھیں۔

"اب میں آ گئی ہوں نا آپا! آج نیمل کی خوشی کا دن ہے، آپ روئیں گی تو وہ اداس ہو جائے۔"نجف نے دھیمی اور محبت بھری آواز میں ان کے آنسو پونچھے اور پھر انہیں تھام کر کرسی پہ بٹھایا مبادہ وہ کہیں گر ہی نہ جائیں۔کئی لوگ دیکھ رہے تھے۔کئی لوگ باتیں بنا رہے تھے۔دس سال پہلے ہوئے حادثے پھر سے زندہ ہو چکے تھے اور لوگوں کو بحث کرنے کو وجہ مل گئی تھی۔نجف، ان کے دونوں ہاتھ تھامے بیٹھی تھی۔زہرہ بیگم اپنے خاندان کے ایک ایک فرد کا نام لے کر پوچھ رہی تھیں اور نجف بنا کسی اکتاہٹ کے انہیں محبت سے بتا رہی تھی۔اچانک اس کی نظر اٹھی اور سامنے سے آتے سقراط پہ ٹھہر گئی۔

سیاہ کرتے اور ٹراؤزر میں ملبوس، بالوں کو پونی میں قید کیے وہ پورے ہال میں سب سے نمایاں شخصیت کا مالک لگ رہا تھا۔وہ مضبوط قدم دھرتا آگے بڑھ رہا تھا اور پھر ٹھہر گیا۔پوری کائنات ٹھہر گئی۔سقراط کی نظر اس ظالم اپسرا پر پڑ چکی تھی۔پل بھر کے لیے ہال کا سارا شور،

شہنائیاں اور روشنیاں اندھیرے میں ڈوب گئیں۔ دل کی دھڑکن کیسے رکتی ہے، وہ آج دس سال بعد پھر سے جان گیا تھا۔ وہ چند لمحے بے یقینی سے اسے دیکھتا رہا جو ستاروں کی مانند دمک رہی تھی پھر اگلے پل دل کے اندر نفرت کا ایک سیاہ ابلتا ہوا طوفان اٹھا۔ وہ عورت جس نے اس کی زندگی کو برباد کیا تھا، جس نے شبگیر خاندان کے غرور کو مٹی میں ملایا تھا، وہ آج اتنے مان سے ان کے بیچ کھڑی تھی۔ سالوں پہلے اس کی محبت جتنی گہری تھی، اس کی نفرت اب اتنی ہی کٹیلی ہو چکی تھی۔ ان دونوں کو یوں ایک چھت تلے دیکھ کر کئی جاننے والے رشتہ داروں اور مہمانوں نے آپس میں سرگوشیاں کرنا شروع کر دیں۔

"دیکھو... نجف بزدار اور سقراط شبگیر ایک ساتھ ہیں۔"

"پورے شہر کو پتا ہے ان کے ماضی میں کیا ہوا تھا..."

"ارے بس بھی کرو سقراط اپنی سزا کاٹ چکا ہے۔"

"لیکن کوئی عورت اس شخص کو کیسے معاف کر سکتی ہے جو اسی کی بہن پہ بری نظر ڈالے؟"

"سچ جھوٹ اللہ کو معلوم ہے۔"

"ارے بھئی اگر سقراط سچا ہوتا پھر سزا کیوں کاٹتا؟ اس نے اپنے منہ سے جرم قبول کیا تھا۔"

سرگوشیاں نجف کے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھیں مگر اس کا چہرہ مہر بند فائل کی طرح سپاٹ رہا۔ وہ یہاں کسی ماضی کا حساب کرنے نہیں آئی تھی، وہ یہاں صرف نیمل اور زہرہ بیگم کے لیے آئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سقراط کے لیے گہرا ٹھہراؤ تھا مگر کوئی خوف نہیں تھا۔ سقراط نے اپنے جبڑوں کو بھینچ لیا۔ وہ اس عورت کو اپنے سامنے ایک پل کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے نجف کو ایسی سرد مہر نظر سے دیکھا جو کسی کو بھی اندر تک کاٹ کر رکھ دے اور پھر بنا ایک لفظ بولے، وہ ایک سائے کی طرح اس کے قریب سے گزرتا ہال کے ایگزٹ کی طرف بڑھ گیا۔ ہال سے باہر نکل کر وہ بینکوئٹ ہال کے سنسان اور ٹھنڈے لان میں آ گیا۔ باہر کی سرد ہوا اس کے تپتے ہوئے چہرے سے ٹکرائی مگر اس کے اندر کی آگ مدہم نہیں ہوئی۔

اس نے ضبط سے ایک گہرا سانس لیا، اپنے ٹراؤزر کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اپنا والٹ باہر نکال لیا۔ اس نے لرزتی انگلیوں سے والٹ

کھولا، جہاں پرانا لاکٹ محفوظ تھا۔

سقراط نے لاکٹ کھولا۔ لاکٹ میں مقید نجف مسکرا رہی تھی۔ وہ نجف جو معصوم تھی۔ سقراط نے مڑ کر ہال کے شیشے کے پار دیکھا جہاں نجف اب تارہ اور نوفہ کو ساتھ لگائے کھڑی تھی۔ سقراط کی آنکھوں میں شدید درد اور بے پناہ نفرت کا ایک ملا جلا طوفان جاگ اٹھا مگر وہ اسے دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ اسے احساس ہوا۔

"وہ پہلے سے زیادہ خوبصورت ہوگئی تھی... مگر وہ اتنی ہی بدصورت کیوں لگ رہی تھی؟"

اس کا چہرہ، اس کا لباس، اس کا وجود دنیا کے لیے اپسرا جیسا تھا مگر سقراط کے لیے اس کی بے وفائی اسے دنیا کا سب سے بدصورت وجود بنا چکی تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے والٹ بند کیا اور اسے واپس جیب میں ڈال لیا۔ وہ اب اس ہال میں دوبارہ قدم نہیں رکھنا چاہتا تھا جہاں وہ ظالم اپسرا موجود تھی۔ نجف، سقراط کی موجودگی کو شیشے کے پار بھی محسوس کر سکتی تھی مگر وہ انجان بنی رہی۔ دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے احساسات کا ایک ایسا سمندر تھا جس کا کنارہ صرف تباہی پر ہی ختم ہو سکتا تھا۔

☆...☆...☆

برائیڈل روم کے اندر وقت جیسے یکلخت سمٹ گیا۔ شادی کی وہ طویل پلاننگ، وہ شاپنگ، وہ ہنسنا بولنا... سب کچھ جیسے ریت کی طرح پھسل کر اس ایک آخری گھڑی پر آ کھڑا ہوا تھا۔ دلہن کے روپ میں بیٹھی نیمل کا دل پسلیوں کے پیچھے تیزی سے طرح دھڑک رہا تھا۔ اسی لمحے کمرے کا بھاری دروازہ کھلا۔ سقراط اور سلال دونوں سنجیدگی سے اندر داخل ہوئے وہ اپنی لاڈلی بیٹی کے نکاح کی باقاعدہ اجازت لینے آئے تھے۔ قاضی ساتھ آیا تھا۔ برائیڈل روم کے اندر وقت جیسے اپنی رفتار بھول گیا تھا۔

چند لمحے پہلے تک باہر ڈھولک، قہقہوں اور مہندی کی خوشبو سے بھرا ہوا ہال اب اس بند کمرے کے دروازے سے بہت دور محسوس ہو رہا تھا۔ یہاں صرف خاموشی تھی... ایسی خاموشی جس میں دلوں کی دھڑکنیں بھی سنائی دے سکتی تھیں۔ کیا واقعی آج سب کچھ بدل جائے گا؟ نامرہ، نوفہ اور نین تارہ خاموشی سے ایک طرف ہٹ گئیں۔ زہرہ بیگم نے اپنی بھیگی پلکیں صاف کی جبکہ دادی نے بے اختیار تسبیح پر انگلیاں پھیرتے ہوئے زیرِ لب دعا پڑھنی شروع کر دی۔ سلال آہستہ آہستہ چلتا ہوا نیمل کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے نیمل کے کانپتے ہوئے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے تو چونک گیا۔

"آپ کے ہاتھ تو برف ہو رہے ہیں، آپی..." وہ مسکرانے کی کوشش کرتا ہوا بولا۔

"اتنا مت ڈریں...آپ کہیں نہیں جا رہیں...بس ہمارے گھر کی دعائیں اپنے ساتھ لے جا رہی ہیں۔"

نیمل نے نم آنکھوں سے اپنے سلال کو دیکھا۔کب وہ چھوٹا سلال بڑا ہوا تھا اسے خود بھی یاد نہ آیا۔اسی لمحے سقراط آگے بڑھا۔اس نے کچھ نہیں کہا۔صرف اپنا مضبوط ہاتھ آہستگی سے نیمل کے سر پر رکھ دیا۔وہ لمس عجیب تھا۔اس میں ایک چچا کا مان بھی تھا،ایک باپ جیسا تحفظ بھی اور یہ خاموش یقین بھی کہ...اگر دنیا کبھی تم پر تنگی پڑ جائے تو یاد رکھنا...تمہارے پیچھے اب بھی ایک گھر کھڑا ہے۔نیمل کی ٹوٹتی ہوئی ہمت جیسے اس ایک لمس سے پھر سانس لینے لگی۔قاضی صاحب نے نکاح نامہ کھولا۔ان کی پُرسکون آواز کمرے میں گونجی۔

"نیمل بنتِ سرمد..."

انہوں نے حق مہر اور نکاح کی تمام شرعی تفصیلات پڑھنے کے بعد نہایت نرمی سے پوچھا۔

"بیٹی...کیا آپ کو یہ نکاح قبول ہے؟"

کمرہ ساکت ہو گیا۔نیمل نے آہستہ سے آنکھیں بند کر لیں۔اس ایک پل میں اسے اپنا بچپن دکھائی دیا۔باپ کی انگلی پکڑ کر چلنا،ماں کی ہمت بننا،اپنے بہن بھائیوں کے لیے لڑنا،گھر کی ہر دیوار...ہر آواز...ہر خوشبو...اس نے لرزتے لب کھولے۔

"قبول ہے۔"

پہلا 'قبول ہے' کہتے ہی جیسے اس نے اپنا بچپن اللہ کے سپرد کر دیا۔قاضی صاحب نے دوسری مرتبہ سوال دہرایا۔

"کیا آپ کو یہ نکاح قبول ہے؟"

اس بار نیمل کی آنکھوں سے ایک آنسو ٹوٹ کر ہاتھ کی پشت پر گرا۔اسے اپنا کمرہ یاد آیا...وہ کھڑکی جہاں بارشیں دیکھی تھیں...وہ الماری...وہ کتابیں...وہ راتیں جب دادی اس کے بالوں میں تیل لگاتی تھیں۔اس نے گہرا سانس لیا۔

"قبول ہے۔"

دوسرے 'قبول ہے' کے ساتھ اس نے اپنے گھر کی ملکہ ہونے کا خراج پیچھے چھوڑ دیا۔
تیسری بار قاضی صاحب کی آواز پہلے سے بھی زیادہ نرم تھی۔

"بیٹی...کیا آپ کو یہ نکاح قبول ہے؟"

نیمل نے آنکھیں کھولیں۔اس نے ایک نظر اپنی ماں کو دیکھا۔پھر اپنے باپ کے لیے دل ہی دل میں دعا کی۔پھر اپنے سلال...پھر سقراط...اپنی دادی...اپنی بہنوں...اور آخر میں زمین طرف دیکھ کر دل میں صرف اتنا کہا۔

"اللہ...اب میں آپکے نام پر ایک نئی زندگی قبول کر رہی ہوں۔میرے نصیب میں محبت،عزت اور سکون لکھ دینا۔"اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"قبول ہے۔"

یہ صرف ایک جواب نہیں تھا۔یہ ایک بیٹی کا اپنے باپ کے گھر سے رخصت ہونے کا اعلان تھا۔ایک عورت کے نئے سفر کا آغاز تھا۔ایک مقدس عہد تھا...جو زمین پر ادا ہوا اور آسمان پر لکھ دیا گیا۔قاضی صاحب نے مسکراتے ہوئے نکاح نامہ اس کے سامنے رکھ دیا۔سلال نے خاموشی سے قلم اس کی طرف بڑھایا۔نیمل نے قلم پکڑا۔
اس کے ہاتھ اس قدر کانپ رہے تھے کہ وہ اپنا نام بھی سیدھا نہ لکھ سکی۔جیسے ہی اس نے آخری حرف مکمل کیا،ایک گرم آنسو کاغذ پر آ گرا۔
سیاہی ذرا سی پھیل گئی۔
یوں لگا جیسے اس کے نام کے ساتھ اس کے بچپن کی آخری نمی بھی ثبت ہو گئی ہو۔
سلال نے فوراً نظریں دوسری طرف پھیر لیں۔اس کی آنکھیں نم تھیں۔وہ کمزور نہیں پڑنا چاہتا تھا۔سقراط نے جھک کر خاموشی سے نیمل کے سر کو اپنے ساتھ لگایا۔
اس نے کچھ نہیں کہا۔کچھ رشتے الفاظ کے محتاج نہیں ہوتے۔ان کی خاموشی ہی ان کی سب سے بڑی دعا ہوتی ہے اور پھر جیسے ہی قاضی

صاحب نے مسکراتے ہوئے باہر کی جانب قدم بڑھائے، کمرے کی خاموشی ٹوٹ گئی۔ زہرہ بیگم بے اختیار نیمل سے لپٹ گئیں۔ دادی کی زبان پر مسلسل دعائیں تھیں۔ نامرہ، نوفہ اور نین تارہ ایک ساتھ نیمل کے گرد سمٹ آئیں۔ ہنسی بھی تھی، آنسو بھی تھے، دعائیں بھی تھیں اور ان سب کے درمیان ایک لڑکی تھی۔ جو چند لمحے پہلے تک صرف کسی کی بیٹی تھی اور اب کسی کی شریکِ حیات بھی بن چکی تھی۔ فضا میں ایک اور آواز بھی ابھر رہی تھی۔

"ہیپی برتھ ڈے ہینری... ہیپی برتھ ڈے!" مگر نیمل شبگیر اسے مکمل طور پہ نظر انداز کر چکی تھی۔ ان تمام جزباتی اور رقت آمیز مناظر کو دیکھتے ہوئے برائیڈل روم کے ایک نسبتاً کم روشن کونے میں نجف خاموش کھڑی تھی۔ وہ نیمل کے قریب رہنا چاہتی تھی مگر دادی کی نگاہوں میں اسکے لیے جو نفرت تھی وہ اس کی وجہ سے پیچھے ہٹ کر کھڑی تھی۔ اس لمحے وہ سقراط کی ایک ایک حرکت کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ کس طرح وہ سخت جان انسان نیمل کے لیے شفیق باپ بن گیا تھا۔ اس نے دیکھا کس طرح سقراط کی آنکھیں نیمل کے دستخط کرتے وقت کیسے نم ہوئی تھیں۔ نجف کے وجود پر اس وقت آسمانی کا جوڑا چمک رہا تھا، مگر اس کے اندر ایک الگ ہی جنگ چھڑ چکی تھی۔ سقراط کا یہ روپ دیکھ کر ماضی کے کئی خوبصورت اور سحر انگیز مناظر اس کے تصور کے پردے پر لہرائے۔ اسے یاد آیا جب دس سال پہلے، اسی سقراط نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا تھا کہ 'جلد ہمارا نکاح ہو جائے گا' اسے یاد آیا جب وہ اس کی انگلیوں کو اپنی انگلیوں میں الجھاتے ہوئے دنیا کی تمام رعنائیوں کو اس کے قدموں میں ڈھیر کرنے کے دعوے کرتا تھا۔ وہ ماضی کتنا خوبصورت تھا، وہ سقراط کتنا سچا تھا!

"یہ سب جھوٹ ہے۔" اسکا زخمی باطن چلا اٹھا۔ چہرے پر کرب کے آثار ابھرے۔ اپنی گھر کی عورتوں کو اس قدر عزت دینے والا شخص دوسروں کی بیٹیوں کو پامال کیسے کر سکتا تھا؟ واللہ وہ کس قدر جھوٹا تھا۔ وہ کس قدر مکار تھا۔ فنکاری اس پر ختم تھی۔ نجف وہیں کھڑی سلگتی رہی۔ اسکے چہرے پر اذیت ہی اذیت تھی۔ اتنی اذیت تھی کہ رگوں سے بہہ جاتی تو شاید سالوں پہلے اسکا ہارٹ فیل نہ ہوتا۔ شاید وہ اپنے دل کے ساتھ جی رہی ہوتی اور شاید اسکی زندگی اس قدر مشکل نہ ہوتی۔ سقراط کمرے سے باہر نکل گیا اور وہ شکستہ قدم اٹھاتی نیمل کی طرف بڑھ گئی۔

نکاح کی متبرک گھڑی گزرنے کے بعد، اب ہال کا ماحول جشن کے رنگوں میں رنگ چکا تھا۔ نامرہ، نوفہ، تارہ اور نجف نیمل کا پرپل لہنگا سنبھالے، اسے پھولوں کی چادر کے سائے میں آہستہ آہستہ برائیڈل روم سے باہر لائیں۔ اسکے دائیں جانب سرمد صاحب تھے جنہوں نے اپنی بیٹی کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ پورا ہال تالیوں اور شہنائیوں کی گونج سے لرز اٹھا۔ اسٹیج پر شاہ زیب پورے دل سے اپنی دلہن کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اپنے چمکتے ہوئے بلیک تھری پیس سوٹ بوٹ میں ملبوس وجیہہ، شاندار اور پرفیکٹ دولہا لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ اور آنکھوں کی چمک یہ بتانے کے لیے کافی تھی کہ آج وہ دنیا کا سب سے خوش قسمت انسان محسوس کر رہا تھا۔ جیسے ہی نیمل اسٹیج پر پہنچی، شاہ

زیب نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھاما۔اب نیمل کے چہرے کا وہ خوف اور وسوسے نجف کی تسلیوں کے بعد کافی حد تک مدہم ہو چکے تھے اور وہ بھی شاہ زیب کی خوشی کو دیکھ کر دھیمے سے مسکرا رہی تھی۔دونوں صوفے پر رونق افروز ہوئے اور باقاعدہ مہندی کا فنکشن شروع ہو گیا۔

اسی دوران زہرہ بیگم نکاح کے خوبصورت گفٹس ہیمپرز (جس میں چھوہاروں کے ساتھ مصری اور باقی چیزیں موجود تھیں) ایک بڑے تھال سے مہمانوں میں تقسیم کر رہی تھیں۔سقراط خاموشی سے وہ بھاری تھال دونوں ہاتھوں میں تھامے ان کے پیچھے چل رہا تھا۔وہ یہ ڈیوٹی نبھاتے ہوئے کافی فرمانبردار لگ رہا تھا۔اتنے میں نامرہ جلدی سے آئی اور زہرہ بیگم کے کان میں آہستگی سے کچھ کہا۔زہرہ بیگم نے ایک نظر اسٹیج کی طرف دیکھا، پھر اثبات میں سر ہلایا۔

"اچھا...میں ابھی آئی۔"

وہ مڑتے ہوئے تارہ کے پاس بیٹھی نجف کے قریب آئیں۔

"نجف...تم ذرا یہ ڈیوٹی سنبھال لو۔مہمانوں میں یہ پیکٹس بانٹ دو، میں ابھی آتی ہوں۔"

نجف ایک لمحے کو ٹھٹکی۔اس کی نگاہ بے اختیار سقراط پر پڑی جو بدستور خاموشی سے تھال تھامے کھڑا تھا۔چند لمحے وہ تذبذب میں رہی، پھر دھیرے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

اب منظر بدل چکا تھا۔سیاہ سوٹ میں ملبوس وہ مرد خاموشی سے تھال اٹھائے اس کے چند قدم پیچھے چل رہا تھا جبکہ آسمانی لباس میں ملبوس لڑکی ایک ایک پیکٹ اٹھا کر مسکراتے ہوئے مہمانوں کو تھما رہی تھی۔باہر سے دیکھنے والے کے لیے وہ دونوں ایک بے حد خوبصورت منظر تھے۔یوں لگتا تھا جیسے قسمت نے دو ہم سفر ایک ہی راستے پر رکھ دیے ہوں۔مگر حقیقت اس حسن سے کہیں زیادہ بے رحم تھی۔ان دونوں کے درمیان صرف چند قدموں کا فاصلہ تھا...مگر ان قدموں کے بیچ دس برس کی ٹوٹی ہوئی محبت، بے شمار غلط فہمیاں، ادھورے وعدے اور ایسے زخم دفن تھے جنہیں وقت بھی بھر نہ سکا تھا۔یہ ایک ایسی خوبصورتی تھی...جسے اندر ہی اندر گھن لگ چکا تھا۔ایک ایسا رشتہ...جس کی بنیادیں برسوں پہلے خاموشی سے بوسیدہ ہو چکی تھیں۔

☆...☆...☆

تقریب اپنے عروج پہ تھی اور اس تقریب کی گہما گہمی اور اسٹیج کی چمک دمک سے ذرا دور، ہال کی ایک نیم تاریک راہداری میں اب دو وجود ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ آصفہ پھوپھو جن کی آنکھوں میں اس وقت آنسوؤں کا ایک سمندر تیر رہا تھا، نجف کے سامنے کھڑی آبدیدہ ہو رہی تھیں۔ ایک طویل عرصے کے بعد انہیں اپنے سسرال سے کوئی ملا تھا۔ رشتہ اگرچہ سوتیلی نند کا ہی تھا مگر ان کے سسرال میں نجف وہ واحد عورت تھی جو آصفہ پھوپھو سے نفرت نہیں کرتی تھی، جس کے دل میں آصفہ پھوپھو کے لیے کوئی کینہ نہیں تھا۔ نجف نے آصفہ پھوپھو کے لرزتے ہوئے ہاتھوں کو دیکھا تو اس کا اپنا دل بھی ایک انجانے بوجھ تلے دب کر حد درجہ بوجھل ہو گیا۔ ہال کے اندر کی شہنائیاں اس وقت ان دونوں کے مابین حائل خاموشی کو مزید گہرا کر رہی تھیں۔ آصفہ پھوپھو نے اپنے آنسوؤں کو پونچھنے کی ناکام کوشش کی، ان کی آواز حلق میں بری طرح پھنس رہی تھی۔

"میرا حق کیسا ہے، نجف...؟ سب کیسے ہیں وہاں؟"

نجف کے دل کو کسی نے پل بھر کے لیے جیسے مٹھی میں بھینچ لیا۔ اس نے اپنی نظریں چرائیں اور دھیمی آواز میں بولی۔

"سب ٹھیک ہیں، بھابھی!"

"وہ مجھ سے بہت نفرت کرتا ہے نا، نجف؟ مم... میں اسے کیسے بتاؤں کہ میں مجبور تھی... میں نے اپنے حصے کی پوری سزا کاٹ لی ہے۔ پھر وہ مُجھے معاف کیوں نہیں کرتا؟ وہ اپنی ماں کو ایک بار گلے سے کیوں نہیں لگاتا؟"

نجف نے ایک گہری سانس لی۔ اس کی آنکھوں کی چمک اس وقت بالکل ماند پڑ چکی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ حق بزدار اب وہ معصوم بچہ نہیں رہا تھا جسے آصفہ سکندر چھوڑ کر گئی تھیں۔ امجد بزدار کی صحبت نے اس کے اندر سے ماں کا ہر لمس کھرچ کر پھینک دیا تھا۔

"وقت سب کچھ بدل دیتا ہے، بھابھی۔ وہ بھی بدل گیا ہے۔ اب وہ بہت آگے نکل چکا ہے۔"

"میں اس سے بس ایک بار ملنا چاہتی ہوں، اسے دور سے ہی سہی ایک بار دیکھنا چاہتی ہوں۔" آصفہ پھوپھو اب بھرائی ہوئی آواز میں اپنے دل کے ارمان بیان کر رہی تھیں۔

"میرا بیٹا...میرا پوتا...میں ان کے ساتھ اپنی یہ بچی کچی زندگی جینا چاہتی ہوں۔کیا ایک ماں کا اپنی اولاد پر اتنا بھی حق نہیں رہا؟"

نجف نے آصفہ پھوپھو کے تڑپتے ہوئے وجود کو دیکھا مگر وہ انہیں کوئی جھوٹی تسلی نہیں دے سکتی تھی۔اس کے اپنے اندر بہت کچھ تڑپ رہا تھا۔وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ بزداروں کی بساط پر لکھے گئے کچھ فیصلے کبھی بدلے نہیں جا سکتے۔کچھ خواہشیں کبھی پوری نہیں ہوتیں،اور کچھ ارمان ہمیشہ کے لیے ادھورے رہ جاتے ہیں۔اس نے آصفہ پھوپھو کے شانے کو تھپتھپایا اور پھر وہاں سے ہٹ گئی۔اسے واپس جانا تھا۔ اسے آخری بار سب سے ملنا تھا۔وہ نیمل کے پاس آئی،اسکی کلائیوں میں چمکتے ہیروں کے دو کڑے پہنائے اور اس کے ساتھ کچھ وقت بتا کر،زہرہ بیگم سے ملنے کے بعد ہال کے خارجی دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ سقراط جواب تک ہال کے ایک اندھیرے ستون کے پاس کھڑا خاموشی سے سب دیکھ رہا تھا،اس کی نظریں نجف کے جاتے ہی اس کے تعاقب میں دروازے تک گئیں۔جیسے ہی نجف ہال کی حدود سے باہر نکلی،سقراط کو اچانک وہ پورا بھرا ہوا بینکوئٹ ہال،وہ روشنیاں،وہ ڈھولک کا شور اور ہنستے ہوئے مہمان یکلخت ویران لگنے لگے۔فضا کا سارا سحر ٹوٹ گیا اور وہاں صرف ایک گہرا سناٹا رہ گیا تھا۔جہاں اس کا دماغ نجف کے جانے پر پرسکون ہوا تھا وہیں اسکا دل پرانی خواہش کی یاد میں تڑپ اٹھا تھا۔وہ عقل اور دل کی اس ہولناک جنگ میں خود کو اندر ہی اندر کچلتا ہوا محسوس کر رہا تھا مگر اس نے اپنے چہرے پر کوئی تاثر ابھرنے نہیں دیا۔

دوسری طرف،مہندی کا فنکشن اب عروج پر تھا۔شاہ زیب کا چھوٹا بھائی زوریز بار بار پستہ رنگ کے لہنگے میں ملبوس نامرہ کو دیکھ رہا تھا۔وہ جب بھی نامرہ کے پاس سے گزرتا یا اس کے سامنے آتا،وہ اس سے بات کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔چوری چھپے اسے متاثر کرنے کے جتن اٹھا رہا تھا۔مگر نامرہ کے منہ پر ایک ہی تاثر چسپاں تھا۔

"مجھ سے دفع دور رہو!"

فنکشن اپنے پورے عروج کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا مگر بساط کے مہرے اب اپنے اپنے اندر کے طوفانوں کے ساتھ نئی منزلوں کی طرف گامزن تھے۔

☆...☆...☆

بینکوئٹ ہال کے شور سے نکل کر جب نجف نے بزدار پیلس کے پرسکون لاؤنج میں قدم رکھا تو وہاں رات کا گہرا سناٹا تھا۔محل کی دھیمی فانوس لائٹس سنگِ مرمر کے فرش پر پراسرار سائے منعکس کر رہی تھیں۔نجف تھکی ہوئی تھی۔اس نے اپنے جوڑے کا دامن سنبھالے جیسے ہی سیڑھیوں پر پہلا قدم رکھا عقب سے ایک دھیمی مگر مؤدبانہ آواز نے اس کے قدم روک دیے۔

"نجف بی بی..."

نجف نے مڑ کر دیکھا۔ملازمہ شیبا ہاتھ باندھے راہداری کے اندھیرے سے نکل کر سامنے کھڑی تھی۔"بڑے صاحب (امجد بزدار) اپنی اسٹڈی میں کافی دیر سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔انہوں نے سخت تاکید کی تھی کہ جیسے ہی آپ پیلس پہنچیں، آپ کو ان کے پیغام دیا جائے۔"

نجف نے ایک پل کے لیے اپنی پلکیں موندیں۔وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس بلاوے کا مقصد کیا تھا۔

"ٹھیک ہے آپ جائیں..."

اس نے اپنے پسلیوں کے پیچھے دھڑکتے دل کی بے ترتیبی کو قابو کیا، ایک گہرا سانس لیا اور اپنے قدموں کا رخ امجد بزدار کی ذاتی مطالعہ گاہ کی طرف موڑ دیا۔اس نے اسٹڈی کے دروازے پر دستک دی اور اسے کھولتے ہوئے اندر داخل ہوگئی۔اندر پرانی کتابوں اور امجد بزدار کے مہنگے سگار کی تیز بو رچی ہوئی تھی۔وہ چمڑے کی ایک شاہی کرسی پر بیٹھے، میز پر جلتے لیمپ کی مدھم روشنی میں کسی ضخیم کتاب کی ورق گردانی کر رہے تھے۔ان کے چہرے پر سجی سنجیدگی اس کمرے کے ماحول کو مزید بوجھل بنا رہی تھی۔

"السلام علیکم، ڈیڈ!"

امجد صاحب نے کتاب سے نظریں ہٹائے بغیر گہری آواز میں جواب دیا۔

"وعلیکم السلام۔"انہوں نے کتاب کو نفاست سے بند کیا اور نظریں اٹھا کر نجف کو دیکھا۔وہ نک سک سی تیار، کتابوں کی ایک شیلف کے سامنے کھڑی تھی۔کمرے کی مدھم روشنی میں نجف کا لباس موتیوں کی مانند دمک رہا تھا۔

"تم آج تیار ہو یقیناً کوئی اہم تقریب تھی؟" انہوں نے انجان بننے کی بھرپور کوشش کی۔

"میں نیمل کے نکاح پر گئی تھی۔ وہیں سے واپس آئی ہوں۔" نجف نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے، اپنے لہجے کو حد درجہ متوازن رکھتے ہوئے سچ بولا۔ سینے پر بندھے بازو کھولے اور وہ ان کے سامنے رکھے صوفے پر نفاست سے بیٹھ گئی۔ امجد بزدار کے لبوں پر ایک مہیب اور کاٹ دار مسکراہٹ ابھری۔

" کون نیمل؟"

"نیمل سرمد شبگیر ...آپ کی نواسی ڈیڈ!" اس نے جتنے سکون سے کہا تھا امجد صاحب کے جبڑے لمحوں میں بھنچ گئے۔ وہ خشمگیں نگاہوں سے اسے دیکھتے رہے۔

"تم کیا کرنا چاہ رہی ہو نجف؟" انہوں نے سگار کو ایش ٹرے میں مسلا۔ نظریں نجف سے ہٹالیں۔

"میں کچھ بھی نہیں کر رہی... مُجھے ایک تقریب میں بلایا گیا تھا میرا دل کیا تو میں چلی گئی۔"

"اور تمہیں لگتا ہے کہ یہ صحیح ہے؟" وہ اسے نہیں دیکھ رہے تھے۔ اسٹڈی کے ملگجے سے اندھیرے میں ان کے تاثرات واضح دیکھے جاسکتے تھے۔ وہ خود پر ضبط کر رہے تھے۔

"غلط کیسے ہے؟" نجف کے سکون میں کوئی کمی نہیں آئی۔ وہ کمر سیدھی کیے بیٹھی تھی۔ بالکل ویسے ہی جیسے امجد بزدار کی بیٹی کو بیٹھنا چاہیے۔

" کیا تم اپنی بہن کا دکھ بھول گئی ہو؟ کیا تم اتنی آسانی سے بھول گئیں کہ اس خاندان کے لڑکے نے تمہارے ساتھ کیا کیا تھا؟ دس سال پہلے اس نے جو تذلیل ہماری فیملی کی کی، جو زخم اس نے تمہیں اور نشاط کو دیے، تم آج اسی گھرانے کی محفلوں میں جا کر ہماری پیٹھ میں چھرا گھونپ رہی ہو۔ کیا تمہیں یہ غلط نہیں لگتا؟"

نجف کے اندر ایک لمحے کے لیے ماضی کا وہ سلگتا ہوا طوفان جاگ اٹھا مگر اس نے اپنے چہرے کے مصنوعی ماسک کو جمائے رکھا۔ اسے اپنے چہرے پر کوئی دکھ نہیں لانا تھا۔

"میں کچھ نہیں بھولتی ڈیڈ! لیکن مُجھے نشاط کے ساتھ ساتھ زہرہ آپا کا دکھ بھی نظر آتا ہے۔ آپ اپنی سگی بیٹی کو بھول گئے ہوں گے مگر مُجھے میری سوتیلی بہن یاد ہے۔ اس جنگ میں زہرہ آپا کی کوئی غلطی نہیں تھی اور نہ ہی نیمل کی ہے۔ میں ان رشتوں کو دشمنی کی عینک سے نہیں دیکھ سکتی۔"

"تم ان خاندانی معاملات اور سیاست کو سمجھنے کے لیے ابھی بچی ہو، نجف! تمہیں نہیں معلوم کہ دشمن کو اس کے گھر میں گھس کر پامال کیسے کیا جاتا ہے۔"

نجف چند لمحے انہیں دیکھتی رہی۔ وہ نظریں بہت کچھ کھوجتی ہوئی تھیں۔

"اونہوں ڈیڈ! میں بچی نہیں، اکتیس سالہ ایک مختار عورت ہوں۔ بزدار ہسپتال کی چیف میڈیکل آفیسر! اور میں اپنے اندر اتنی سمجھ بوجھ رکھتی ہوں کہ یہ فیصلہ خود کر سکوں، مُجھے کن رشتوں کو عمر بھر نبھانا ہے اور کن رشتوں کو ہمیشہ کے لیے توڑ دینا ہے۔"

امجد بزدار نے اپنی بیٹی کو دیکھا... چند سالوں پہلے تک وہ انکی انگلی تھام کر چلتی تھی۔ ان کے بنا کوئی قدم نہیں اٹھاتی تھی، کوئی فیصلہ نہیں کرتی تھی۔ آج وہی بیٹی ان کے سامنے کھڑی اپنی لکیریں خود کھینچ رہی تھی۔ امجد بزدار کی آنکھوں میں ایک فخر اور شدید غصے کا عجیب امتزاج ابھرا۔

"آپ کو اور کچھ کہنا ہے؟" ان کی بھیانک خاموشی سے گھبرا کر نجف خود ہی بول اٹھی۔

"نہیں..." انہوں نے گہری سانس لی۔ نجف نے مزید کوئی بحث نہیں کی۔

"شب بخیر ڈیڈ!" وہ پر باوقار قدموں کے ساتھ اسٹڈی سے باہر نکل گئی۔ اس کے پیچھے بھاری دروازہ بند ہو گیا، مگر اس کی خودداری کی گونج امجد بزدار کے کمرے کی دیواروں میں ہمیشہ کے لیے قید ہو چکی تھی۔ ٹھیک کہتی تھیں نیلوفر بیگم، وہ بہت بدل گئی تھی۔

نجف جیسے ہی اپنے کمرے میں واپس آئی اس کی نظر سب سے پہلے اپنے بیڈ پر رکھی ایک فائل پہ پڑی تھی۔ وہ چند لمحے سوچتی رہی... کیا وہ جانے سے پہلے کوئی فائل وہاں رکھ گئی تھی؟ اس سے پہلے وہ فائل اٹھاتی، ہاتھ میں پکڑے چھوٹے سے والٹ میں رکھا اسکا فون بج اٹھا۔ اس

نے والٹ کھولا اور فون نکالا۔اسکرین پہ حق لکھا چمک رہا تھا۔نجف نے والٹ بیڈ پہ گراتے فون کان سے لگایا۔

"مُجھے امید ہے یہ فائل دیکھ کر آپ کو خوشی ہوئی ہوگی۔" نجف نے پلٹ کر دیکھا۔دیوار سائز کھڑکی پردوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔وہ کھڑکی کی جانب بڑھی اس نے کھینچ کر پردوں کو ایک جانب کر دیا۔سامنے...دور...پیلس کی دوسری عمارت تھی اور اس کے کمرے کے عین سامنے حق کا کمرہ تھا۔وہ اس وقت کھڑکی میں کھڑا نظر آ رہا تھا۔

"ایسا کیا ہے اس فائل میں؟" نجف نے اس پر نظریں جمائے پوچھا۔کاش یہاں سے اس کے تاثرات پڑھے جا سکتے۔

"خود دیکھ لیں..."

وہ گہری سانس لیتی واپس آئی۔بیڈ سے فائل اٹھائی اور جیسے ہی اسے کھولا سامنے ہی ڈاکٹر یاور کا ریزائن لیٹر دیکھ کر پل بھر کو ساکت ہوئی۔ جھٹکے سے پلٹ کر کھڑکی کی جانب دیکھا۔اسکے یوں پلٹنے پر حق مسکرا دیا۔

" کیسا لگا سرپرائز؟" اس کے ہنسنے کی دھیمی سی آواز آئی تھی۔نجف نے صفحہ پلٹا۔وہاں اسکا معافی نامی بھی تھا۔نجف کی پیشانی پہ بل پڑے۔

"اب یہ سب کیوں؟" اس نے فائل بند کر دی۔حق کو سمجھنا تھوڑا سا مشکل تھا۔

"ضروری تھا...یہ کاپیز ہیں۔اوریجنل فائل آپ کو صبح ہسپتال میں مل جائے گی۔"
وہ سنجیدہ ہوا۔نجف نے گہری سانس لی۔

"اگر ڈاکٹر یاور کو نکالنا ہی تھا تو پھر اس نرس کو کیوں نکالا؟" وہ الجھ گئی۔

"وہ ہاسپٹل کی ریپوٹیشن کے لیے ضروری تھا اور یہ بھی ہاسپٹل کی ریپوٹیشن کے لیے ضروری ہے۔میں کچھ بھی بلاوجہ نہیں کرتا۔"

"ٹھیک ہے..." نجف نے اسکا جواب سنے بنا ہی فون کاٹ دیا۔حق کھڑکی سے ہٹ چکا تھا۔وہ اب کرسی پہ بیٹھی اپنے جوتے اتار رہی تھی

البتہ چہرے کے تاثرات تنے ہوئے تھے۔

"میں تو نام کی ہی سی ایم او ہوں۔ ہوتا تو وہی ہے جو یہ محترم چاہتے ہیں۔" وہ اب باقاعدہ بڑبڑا رہی تھی جب اس کے فون پر بیپ ہوئی۔

"یقیناً تقریب اچھی گزری ہوگی۔" حق کی طرف سے پیغام تھا۔ ساتھ تپانے والی مسکراہٹ بھی تھی۔

"ہاں بیلا بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔" نجف نے تیزی سے ٹائپ کیا اور سینڈ کا بٹن دبایا۔ حق کی مسکراہٹ فوراً غائب ہوگئی۔ اس نے پلٹ کر کھڑکی کی جانب دیکھا۔ نجف کی کھڑکی پہ اب پردے لہرا رہے تھے۔

"ویری فنی!" وہ واقعی تپ گیا تھا پھر بڑبڑاتا ہوا کمرے سے باہر نکلا۔ سارے کمبخت ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔

☆...☆...☆

نکاح اور مہندی کی خوبصورت رات گزرنے کے بعد شبگیر ہاؤس میں اگلی صبح کا آغاز حد درجہ دلکش تھا۔ پورے گھر میں رات کی تقریبات کی رونق ابھی تک باقی تھی۔
نامرہ، تارہ اور نوفہ تینوں... نجف کے لائے گئے بیش قیمتی تحائف کھول کھول کر دیکھ رہی تھیں۔ رات کے تھکے ہارے کچھ قریبی اور خاص مہمان لاؤنج میں بچھے صوفوں اور قالین پر بیٹھے تھے، جہاں ناشتے کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ بڑی بڑی طشتریوں میں گرم چائے کی کیتلیاں، تازہ مٹھائیاں، کھجوریاں اور شہر کی مشہور بیکری کا گرما گرم سامان میز پر سجا ہوا تھا۔ ہر طرف ایک خوبصورت گہما گہمی تھی کیونکہ آج شام ہی نیمل کی بارات اور رخصتی کی بڑی تقریب تھی۔ ان سب کے درمیان نیمل تر و تازہ اور خوبصورت لگ رہی تھی۔ وہ اپنی تینوں بہنوں کو تحائف کھولتے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ لاؤنج کے ایک کونے میں سرمد صاحب اپنی چائے کا مگ ہاتھ میں لیے آ کر بیٹھے۔ انہوں نے سامنے دیوار پر لگے بڑے ایل ای ڈی ٹی وی کا ریموٹ اٹھایا اور صبح کی خبریں دیکھنے کے لیے ٹی وی آن کر دیا۔ ٹی وی اسکرین پر مارننگ نیوز کا بلیٹن شروع ہی ہوا تھا کہ نیوز اینکر کی آواز نے پورے لاؤنج کے ماحول کو یکلخت بوجھل کر دیا۔

"آج کی سب سے ہولناک اور افسوسناک خبر... دو دن پہلے اغوا ہونے والی پندرہ سالہ معصوم لڑکی کی لاش گزشتہ رات مضافاتی علاقے کے ایک ویران پلاٹ سے برآمد کر لی گئی ہے۔ میڈیکل رپورٹ کے مطابق، مقتولہ کو قتل کرنے سے پہلے شدید جنسی زیادتی کا نشانہ بنایا گیا..."

ٹی وی پر اس معصوم بچی کی پرانی تصویر اور جائے وقوعہ کے لرزہ خیز مناظر دکھائے جا رہے تھے۔ سرمد صاحب جس سنجیدگی اور گہرائی سے یہ خبر سن رہے تھے، ان کا دل پل بھر کو رک گیا۔ ان کے اپنی چار بیٹیاں تھیں، بیٹیوں کے باپ ہونے کے ناطے ان کے چہرے پر شدید غصہ، بے بسی اور خوف یکجا ہو کر ابھرا۔ انہوں نے ٹی وی بند کرنے کے لیے ریموٹ والا ہاتھ اوپر اٹھایا مگر عین اسی لمحے ان کا ہاتھ ہوا میں ہی معلق ہو کر رہ گیا۔ ٹی وی اسکرین پر اینکر کی آواز دگنی تیز ہوئی۔

"پولیس نے کارروائی کرتے ہوئے اس درندگی میں ملوث مرکزی ملزمان کو گرفتار کر لیا ہے۔ ملزمان کا تعلق شہر کے ایک با اثر اور امیر گھرانے سے بتایا جاتا ہے۔ ملزمان کی تصویریں اس وقت اسکرین پر دیکھی جا سکتی ہیں..."

کیمرے کا لینس گھوما اور ہتھکڑیوں میں جکڑے، منہ چھپاتے ہوئے جس اکیس سالہ لڑکے کا چہرہ اسکرین پر بالکل واضح ہو کر ابھرا...وہ کوئی اجنبی نہیں تھا۔ وہ شاہ زیب کا چھوٹا بھائی زوریز تھا۔ اسکرین پر دکھایا جا رہا تھا کہ پولیس اسے لے جا رہی تھی، اس کے ہاتھوں میں لوہے کی ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ اگلا شاٹ شاہ زیب کے اس سجے سجائے گھر کا تھا جہاں لائٹس لگی تھیں مگر اب وہاں افراتفری کا ماحول تھا۔ اسی فوٹیج میں شاہ زیب بھی نظر آیا تھا جو بدحواسی اور شدید غصے میں پولیس والوں کے گریبان پکڑ رہا تھا، چیخ رہا تھا اور اپنے بھائی کو چھڑانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

سرمد صاحب کے ہاتھ سے ریموٹ چھوٹ کر قالین پر گر گیا۔ ان کی آنکھیں ابل کر اسکرین پر جم گئیں۔ سلال...جو اسی لمحے سرمد صاحب سے بارات کے کسی انتظام کے بارے میں کچھ پوچھنے کے لیے لاؤنج میں داخل ہوا تھا، وہ ان کے عقب میں اب ایک پتھر کے بت کی طرح کھڑا تھا۔ اس کی نظریں ٹی وی پر جمی تھیں۔ بار بار زوریز کو دکھایا جا رہا تھا۔ سرمد صاحب اور سلال دونوں کو لگا جیسے زمین نے گھومنا بند کر دیا ہو۔ ان کی پوری دنیا الٹ پلٹ ہو کر رہ گئی۔ چائے اور مٹھائیوں کی وہ خوشبو اب ان کے حلق میں زہر بن چکی تھی۔ مہمان تو ٹی وی کی جانب خاص متوجہ نہیں تھا مگر لاؤنج کے دوسرے کونے میں بیٹھی دادی نے اپنی عینک درست کی اور اسکرین پر دکھائی دینے والی افراتفری کو غور سے دیکھتے ہوئے معصومیت اور تشویش سے پوچھا۔

"یہ ٹی وی پہ شاہ زیب ہے؟"

دادی کا یہ سوال جیسے سلال کے اعصاب پر ہتھوڑے کی طرح لگا۔ اس سے پہلے کہ نیمل، نامرہ یا گھر کا کوئی اور فرد ٹی وی کی طرف دیکھتا، سلال نے بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھ کر ٹی وی کا مین سوئچ بند کر دیا۔ اسکرین یکلخت سیاہ ہو گئی۔ سرمد صاحب کے جسم میں اس وقت کاٹو

تو خون نہیں تھا۔ان کا چہرہ کاغذ کی طرح سفید پڑ چکا تھا،لب کپکپا رہے تھے۔سلال نے اپنے اندر ابلتے ہوئے بارود کو زبردستی ضبط کیا اور تیزی سے آگے بڑھ کر اپنے باپ کے لرزتے ہوئے کندھوں پر دونوں ہاتھ رکھ دیے۔

"پاپا پلیکس..."سلال نے اپنی آواز کو جتنا ہو سکے نارمل اور دھیما رکھتے ہوئے کہا،مگر اس کے اپنے ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈے ہو رہے تھے۔

"سا...لال..."سرمد صاحب نے خوفزدہ اور پھٹی پھٹی نظروں سے سلال کو دیکھا۔

"آپ ریلیکس ہو کر بیٹھیں..."سلال نے جھک کر ان کے کان میں رازداری سے کہا۔" کسی سے اس بات کا ذکر نہ کیجیے گا۔اندر کسی کو کچھ پتا نہیں چلنا چاہیے پاپا۔میں ابھی آتا ہوں۔"

سلال نے سرمد صاحب کو صوفے پر سیدھا کر کے بٹھایا،ان کے سامنے پانی کا گلاس رکھا اور اپنا فون اٹھاتا ہوا تیز اور نپے تلے قدموں سے باہر گیٹ کی طرف بڑھ گیا
اس کا چہرہ اب غصے اور تشویش کی اس خونی بساط پر ایک مہرے کی طرح سخت ہو چکا تھا،اور وہ یہ جاننے کے لیے تیار تھا کہ شبگیر خاندان کے اس آشیانے پر یہ کون سی ناگہانی قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔

☆...☆...☆

یہ دو دن پہلے کی بات تھی۔شاہ زیب کی شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں اور اسی سلسلے میں اس کے چھوٹے بھائی زوریز کے دو قریبی دوست دوسرے شہر سے خاص طور آئے ہوئے تھے جبکہ ایک دوست اسی شہر کا رہنے والا تھا۔وہ تقریباً چاروں ہی اوباش تھے۔جوان خون، بیوروکریٹ باپ کا بے تحاشا پیسہ،قانون کا کوئی خوف نہ ہونا اور حد درجہ برانڈڈ مگرز ہریلی صحبت۔ان تینوں چیزوں نے مل کر ان کے اندر کی انسانیت کو مٹا دیا تھا۔نکاح سے ٹھیک ایک رات پہلے زوریز اپنے تینوں کے ساتھ انجوائے منٹ کے لیے گھر سے نکل آئے۔شادی والا گھر تھا،سو طرح کے کام تھے۔شاہ زیب نے بھی زیادہ غور نہیں کیا۔گاڑی میں انہوں نے ڈرگز لیے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت گنوا بیٹھے۔
راستے میں ایک جگہ انہوں نے ایک اکیڈمی سے پیدل گھر جاتی ہوئی پندرہ سالہ لڑکی کو دیکھا۔گاڑی اس کے پیچھے لگا دی۔ایک نسبتاً سنسنان مقام پہ پہنچا کر انہوں نے زبردستی اس لڑکی کو گاڑی میں کھینچا اور منہ دبا کر وہاں سے فرار ہو گئے۔وہ اسے شہر کے پچھلے مضافات میں واقع

ایک پرانے ہوٹل میں لے گئے جسے اوباش لوگ اکثر خفیہ عیاشیوں کے لیے استعمال کرتے تھے۔انہوں نے ہوٹل کے عملے کو بھاری رقم دی اورلڑکی کواندر لے گئے۔وہ نشے میں تھے۔چاروں نے اس لڑکی کوزیادتی کانشانہ بنایا۔اسے زبردستی ڈرگز دیے گئے تاکہ وہ ہوش میں نہ رہےاور چیخے چلائے نا۔اس لڑکی کو نشے میں دھت چھوڑ کر،زوریزاگلے دن بالکل نارمل بن چکا تھا۔وہ اپنے بھائی کی مہندی اورنکاح کی تقریب میں سوٹ بوٹ پہن کرمعصومیت کالبادہ اوڑھے گھومتا رہا، یہاں تک کہ اس نے بات چیت کی بہت کوشش کی۔کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ اس ہنستے مسکراتے چہرے کے پیچھے ایک درندہ چھپا ہوا تھا۔پچھلی رات جیسے ہی مہندی کی تقریب ختم ہوئی اورسب مہمان چلے گئے، یہ چاروں لڑکے دوبارہ اسی پرانے ہوٹل پہنچے۔وہاں انہوں نے بھاری مقدار میں نشہ کیا۔نشے کی زیادتی اورحیوانیت کے زیرِاثر انہوں نے دوبارہ اس لڑکی کے ساتھ بدترین سلوک کیا۔جب وہ لڑکی ہوش میں آئی اورخوف سے پاگلوں کی طرح چیخنے لگی۔جب انہوں نے دیکھا کہ بات ان کے بس سے باہر ہورہی ہےتو زوریزاوراس کے ساتھیوں نے بے رحمی سے اس کا گلا دبا کراسے ہمیشہ کے لیے خاموش کردیا۔جرم چھپانے کی جلدی میں، وہ لاش کوگاڑی کی ڈگی میں ڈال کرشہر کےایک ویران پلاٹ کے کچرے کے ڈھیر میں پھینک کر بھاگ گئے۔مگرگناہ کبھی چھپتانہیں ہے۔جہاں انہوں نے لاش پھینکی، وہاں قریب ایک سیکیورٹی سی سی ٹی وی کیمرہ نصب تھا،جس کے اینگل میں ان کی گاڑی کی موومنٹ بالکل واضح آگئی۔رات کے اندھیرے میں بھی کیمرے نے گاڑی کی نمبر پلیٹ کواسکین کرلیا۔پولیس نے جب صبح لاش برآمد کی اورفوٹیج کھنگالی تو نمبر پلیٹ کا ڈیٹا سیدھا زوریز کے نام پرنکلا۔

اس کے دوسرے شہر سے آئے ہوئے دونوں دوست پچھلی رات جرم کرنے کے فوراًبعد ہی الٹی فلائٹ پکڑ کراپنے شہر بھاگ چکے تھےمگر چونکہ گاڑی زوریز کی تھی اور جائے وقوعہ پراس کی موجودگی کے تکنیکی ثبوت موجود تھے،اس لیے قانون کاشکنجہ سیدھااس کے گرد کسا گیا۔صبح ہوتے ہی شاہ زیب کے گھر کے باہر جہاں بارات کی روانگی کے لیے پھول لگائے جارہے تھے،پولیس کی تین گاڑیاں پہنچ چکی تھیں۔یوں توان کاتعلق ایک بااثر بیوروکریٹ خاندان سے تھا،ان کے والدسلطان احمد کی پہنچ حکومت کے اعلیٰ ایوانوں تک تھی مگراس بارکیس اتنا ہولناک تھااور پولیس کے پاس لوہے کے پختہ ثبوت تھے کہ کوئی بھی سفارش یا پیسہ کام نہ آسکا۔میڈیا اس کیس کولائیو کورکررہا تھا جس کی وجہ سے پولیس کے اعلیٰ افسران پربھی شدید دباؤ تھا۔پولیس نے شاہ ریز کوبستر سے اٹھا کر،ہتھکڑیاں لگا کرگاڑی میں ڈال دیا۔

شاہ زیب کے لیے یہ ہولناک تھا جس نے اس کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی تھی۔اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اس کا چھوٹا بھائی، جسے وہ اب تک ایک لاڈلا بچہ سمجھتا تھا،اتنا مکروہ اوروحشیانہ کام کرسکتا تھا۔شاہ زیب بدحواسی کی حالت میں پولیس والوں کے سامنے چیخ رہا تھا،ثبوت مانگ رہا تھامگر جب انسپکٹر نے اسے ثبوت دیےتو شاہ زیب کے اپنے چہرے کارنگ اڑ گئے۔شادی کی خوشیاں اب ایک بھیانک ماتم میں بدل چکی تھیں۔چندہی گھنٹوں کے اندر، یہ خبرسوشل میڈیا اورٹی وی چینلز پرشہر کی سب سے بڑی بریکنگ نیوز بن چکی تھی۔ہرطرف زوریز کا چہرہ اوران کے خاندانی نام کی دھجیاں اڑائی جارہی تھیں۔شاہ زیب چندلمحوں کے لیے سرپکڑ کر بیٹھ گیا۔آج شام اس کی بارات جانی تھی،اس کے گھر دلہن آنی تھی مگراب اس کی اپنی خاندانی بساط ہمیشہ کے لیے الٹ چکی تھی۔چاروں طرف فون کی گھنٹیاں

بج رہی تھیں اور شاہ زیب کو بہت کچھ اندھیر ہوتا نظر آیا۔

☆...☆...☆

نیمل اپنے بیڈ کے پاس رکھے بڑے سوٹ کیس میں اپنے پسندیدہ اور قیمتی جوڑے نفاست سے تہہ کر کے رکھ رہی تھی۔اس کے ہاتھوں پر رچی ہوئی مہندی کے خوبصورت بیل بوٹے کھڑکی سے آتی صبح کی دھوپ میں چمک رہے تھے۔وہ اپنی زندگی کے اس سب سے بڑے سفر کی تیاری میں مگن تھی جب اچانک میز پر رکھا اس کا فون وائبریشن کے ساتھ بج اٹھا۔اسکرین پر ایک انجان نمبر چمک رہا تھا۔نیمل نے ایک پل کے لیے دیکھا اور مصروفیت کے باعث اسے نظر انداز کر دیا۔مگر فون طرح بار بار بجتا رہا۔بالآخر اس نے تنگ آ کر فون اٹھا لیا۔

"ہیلو،نیمل شبگیر؟"فون اٹھاتے ہی دوسری طرف سے ایک مرجھائی ہوئی نسوانی آواز ابھری۔

"یس؟"نیمل نے ایک خوبصورت جوڑے کو سوٹ کیس میں رکھتے ہوئے پیشہ ورانہ لہجے میں جواب دیا۔

"میں آصمہ بات کر رہی ہوں..."

" کون آصمہ؟"نیمل کے ابرو دھیمے سے سکڑے۔

"چند دن پہلے آپ نے دانیال کا جو کیس جیتا تھا...میں وہ آصمہ ہوں۔"

یہ نام سماعت سے ٹکراتے ہی کمرے کی فضا یکلخت بدل گئی۔دوسری جانب خاموشی چھا گئی جبکہ نیمل کے ہاتھ پل بھر کو ساکت ہو گئے۔اس کے ماتھے پر گہری شکن ابھری۔ایک وکیل کے طور پر وہ اس کیس سے الگ ہو چکی تھی،آخر وہ لڑکی آج،اس کی رخصتی کے دن اسے فون کیوں کر رہی تھی؟ نیمل نے خود کو سنبھالا اور سرد لہجے میں پوچھا۔

"جی بتائیں آصمہ،میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟"

"کیا...کیا مُجھے میرے گناہ کی سزا مل سکتی ہے؟" آصمہ کی آواز میں اب سسکیوں کا تڑپتا ہوا عنصر شامل ہو چکا تھا۔

"کیا مطلب؟" نیمل نے فون پر اپنی گرفت مضبوط کی۔

"نیمل شبگیر صاحبہ! آپ کو اندازہ نہیں ہے آپ نے میرے ساتھ کیا کیا ہے۔" آصمہ دوسری طرف پھٹ پڑی۔ "ایک ریپ وکٹم کے طور پر جینا اتنا مشکل نہیں تھا جتنا اب اس سچ کے ساتھ جینا ہو گیا ہے۔ کچھ لوگ میری اور دانیال کی تصویروں کے ساتھ زانی کا ٹیگ لگا کر اسے سوشل میڈیا پر وائرل کر رہے ہیں۔ میرے جاننے والے، میرے کلاس فیلوز مُجھے جینے نہیں دے رہے۔ کیا آپ جانتی ہیں یہ کیسی ہولناک ذلت ہے؟"

"جب آپ کو یہ ذلت گناہ کے وقت یاد نہیں آئی تھی آصمہ، تو اب کیوں یاد آ رہی ہے؟ جب آپ دانیال کے ساتھ اس بند کمرے میں خدا کی حدود کو پامال کر رہی تھیں تب آپ کو اس خاندانی عزت اور سوشل میڈیا کی ذلت کا خیال کیوں نہیں آیا؟" نیمل کے تاثرات بدل گئے۔

"آپ نہیں جانتیں آپ نے ہمارا گناہ دنیا کے سامنے لا کر کتنا بڑا گناہ کیا ہے۔" آصمہ نے روتے ہوئے الزام نیمل پر دھرنا چاہا۔ "آپ نے دانیال کو تو بچا لیا لیکن میرا کیا؟"

"میں نے دانیال کو ریپ کے جھوٹے الزام سے بچایا ہے، زنا کے الزام سے نہیں۔ دانیال پر ایک ایسے جرم کا الزام تھا جو اس نے نہیں کیا تھا، وہ تعلق رضامندی کا تھا۔ زنا کا مقدمہ ریاست کا ہے، میرا نہیں۔ میرا کام قانون کے کٹہرے میں جھوٹ کو برہنہ کرنا تھا، اور میں نے وہی کیا۔"

"میں نے بس محبت کی تھی..." آصمہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔

"محبت کبھی انسان کو گناہ کا لائسنس نہیں دیتی۔ اگر ہر حرام تعلق کا نام محبت رکھ دیا جائے تو پھر دنیا میں کوئی گناہ، گناہ نہ کہلائے۔"

"میں اس ذلت کے ساتھ اب نہیں جی سکتی...میں مر جاؤں گی!"

"ٹھیک ہے، اگر جینا اتنا ہی محال ہے تو پھر ریاستی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائیں۔ جائیں اور جج کے سامنے کھڑے ہو کر بتائیں کہ آپ لوگوں نے جو گناہ کیا ہے، آپ کو اس کی شرعی اور قانونی سزا چاہیے۔" وہ لمحے بھر کو رکی۔

"آپ کو اس بات کی تکلیف نہیں ہے کہ آپ نے گناہ کیا، آپ کو تکلیف اس بات پر ہے کہ آپ کا گناہ پکڑا گیا ہے۔"

آصمہ کچھ بول نہ پائی۔ اسکی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ نیمل کھڑی نہیں رہ پائی۔ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

"آصمہ! تم جیسی لڑکیاں اور دانیال جیسے لڑکے یہ سمجھتے ہیں کہ ہوٹل کے بند کمروں کے پیچھے، ہائی سوسائٹی پارٹیوں میں، کنسینٹ اور ماڈرن لائف کا لیبل لگا کر جو چاہے کر سکتے ہو۔ تم لوگ خدا کی حدود توڑتے ہوئے بے نیاز پھرتے ہو مگر بھول جاتے ہو کہ گناہ صرف بند کمرے میں نہیں رہتا۔ کبھی نہ کبھی وہ دروازہ توڑ کر باہر آ ہی جاتا ہے۔"

وہ پریشان ہو چکی تھی۔ اسکا اصل مقصد آصمہ کے والد کا سچ سامنے لانا تھا اور دانیال کو اس جرم کی سزا سے بچانا تھا جس میں وہ اکیلا شریک نہیں تھا۔

"اگر تمہارا یہ کیس اس طرح سامنے نہ آتا، تو تم جیسی سینکڑوں لڑکیاں آج بھی اس ذلت سے ناواقف رہتیں جو گناہ سامنے کے بعد ان کا مقدر بن سکتی ہے۔ پتا ہے آصمہ؟ کبھی کبھی ہم لڑکیاں اپنی ذلت اپنے ہاتھوں سے چنتی ہیں۔" نیمل نے ایک سرد سانس خارج کیا۔ آصمہ کے لیے حقیقتاً برا لگ رہا تھا۔

"ریاست کا قانون تمہیں زنا کی سزا دے یا نہ دے مگر تمہارا سوشل میڈیا پر زانی کے نام سے پکارا جانا، تمہاری اپنی ہی لکھی ہوئی کتاب کا ایک ورق ہے۔ اب اس ذلت کو سمیٹو یا عدالت جاؤ، یہ تمہارا اور تمہارے خدا کا معاملہ ہے۔ میں کچھ نہیں کر سکتی۔ ایم سوری..."

نیمل نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے فون کاٹ دیا اور اسے بیڈ پر پٹخ دیا۔ اس کا تنفس تیز ہو چکا تھا۔ اس کے مہندی لگے ہاتھ ہلکے سے کپکپا رہے تھے۔ کبھی کبھی کچھ حادثات بھیانک روپ اختیار کر لیتے ہیں اور سوشل میڈیا پہ آصمہ کی تصاویر وائرل کرنے والا اور کوئی نہیں اسکے اپنے قریبی لوگ ہوں گے۔ اسکا باپ سیاست دان تھا وہ اس معاملے سے جلد نبٹ لیتا مگر ضمیر کی عدالت؟ وہاں آصمہ کو اکیلے ہی لڑنا تھا۔

آج کا معاشرہ، ہمارا ماحول اور اس میں سانس لیتی نوجوان نسل جدت پسندی اور نام نہاد آزادی کے نام پر ایک ایسے اندھے پن کا شکار ہو چکی ہے، جہاں گناہ اور ثواب کے مابین کھینچی گئی لکیریں یکسر دھندلا گئی ہیں۔ ہوٹل کے بند کمروں، پوشیدہ نیٹ ورکس اور وقتی لذتوں کو کنسینٹ (رضامندی) کا جدید لبادہ اڑھا کر اس قدر عام کر دیا گیا ہے کہ دلوں سے خدا کا خوف ہی رخصت ہو چکا ہے۔ سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ موجودہ دور کے ریاستی اور دنیاوی قوانین میں لوگوں کو زنا جیسے قبیح گناہ کی وہ سخت سزا نہیں ملتی جو ہونی چاہیے جس کی وجہ سے ہماری نسل خود کو ہر ضابطے سے آزاد اور محفوظ سمجھ کر گناہ کی دلدل میں بے نیاز پھرتی ہے۔ اگر آصمہ اور دانیال جیسا کیس ننگا ہو کر معاشرے کے سامنے نہ آئے، تو آج کی لڑکیوں اور لڑکوں کو کبھی یہ یاد ہی نہ رہے کہ مکر و فریب کی اس چکا چوند سے پرے، رسوائی کے اس کٹہرے میں زنا کی کیا ہولناک سزا ہوتی ہے۔ انسان بھلے دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک کر مظلوم بننے کا کارڈ کھیل لے مگر جب قدرت کا ترازو ہلتا ہے تو وہ انسان کو اسی کے گناہ کی ذلت کے ساتھ زندہ درگور کر دیتا ہے۔ ہر گناہ اپنی سزا ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے بس بعض سزائیں فوراً دکھائی نہیں دیتیں۔

کئی لمحے یونہی گزر رہے۔ نیمل بیٹھی رہی۔ کمرے میں دوبارہ وہی بوجھل سکوت تھا۔ وہ خود کو نارمل کرنے کے لیے دوبارہ سوٹ کیس کی طرف مڑی ہی تھی کہ کمرے کے دروازے پر ایک بدحواس سی دستک ہوئی۔ نیمل نے چونک کر سر اٹھایا۔ دروازے کی چوکھٹ پر سلال کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ اس وقت کاغذ کی طرح سفید ہو چکا تھا، ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں اور اس کی آنکھوں میں وحشت اور پریشانی کا طوفان تھا۔

"آپی...وہ..." سلال کی آواز اس کے حلق میں آ کر پھنس گئی۔

"سب ٹھیک ہے، سلال؟" نیمل کا دل کسی انکہے خوف سے دھڑک اٹھا۔ وہ ہاتھ میں پکڑا جامنی جوڑا سوٹ کیس میں ہی چھوڑ کر تیزی سے آگے بڑھی۔

سلال کے گلے کی گلٹی ڈوب کر ابھری۔ اس کی نظریں نیمل کے ان ہاتھوں پر گئیں جہاں کل رات رچی مہندی کے سرخ بیل بوٹے صبح کی دھوپ میں چمک رہے تھے۔ رخصتی کے دن، شادی والے گھر میں، اپنی بہن کو اتنی ہولناک خبر وہ کیسے دیتا؟ اس کے اپنے لب کانپ رہے تھے۔

"بتاؤ سلال، کیا ہوا ہے؟ تم اس طرح کیوں ری ایکٹ کر رہے ہو؟" نیمل نے اس کے سامنے کھڑے ہوتے سخت لہجے میں پوچھا۔

اور پھر... چند ہی لمحوں میں سلال نے خود پر قابو پاتے ہوئے نیمل کو وہ سب کچھ بتا دیا جو ٹی وی اسکرین پر نشر ہو چکا تھا۔ زوریز کو پولیس نے گرفتار کر لیا تھا اور وہ پندرہ سالہ معصوم لڑکی کا اغوا، گینگ ریپ اور مرڈر کیس... سلال کا ایک ایک لفظ نیمل کی سماعت پر کسی جلتے ہوئے تیزاب کی طرح گرا۔ سچائی کا یہ زہر رگوں میں دوڑتے ہی نیمل کی کنپٹی کی رگیں تن گئیں اور وہ بری طرح پھول آئیں۔ اس کا سر چکرانے لگا، مہندی کی وہ خوشبو یکلخت، بھیانک بو میں بدل گئی۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے کبھی سلال کو دیکھ رہی تھی اور کبھی بیڈ پہ پڑے اپنے فون کو جس کی اسکرین جل بجھ رہی تھی۔ شاہ زیب فون کر رہا تھا اور نیمل؟ وہ بس ساکت تھی۔

☆...☆...☆

کچھ گھنٹوں بعد وہ شاہ زیب کے بالکل سامنے کھڑی تھی۔ گزشتہ رات ہی ان کا نکاح ہوا تھا، انہوں نے اپنی زندگی کے لاکھوں خوبصورت خواب بنے تھے مگر انہوں نے کبھی خواب کے بدترین حصے میں بھی نہیں سوچا تھا کہ نکاح کے بعد اور رخصتی سے ٹھیک پہلے، ان کی پہلی باقاعدہ ملاقات زندگی کے اس گھناؤنے موڑ پر ہوگی۔

میز پر نیمل کے بالکل سامنے زوریز کی کرائم فائل کھلی پڑی تھی۔ اس فائل میں پولیس کے پختہ ثبوت، جائے وقوعہ کی سی سی ٹی وی فوٹیجز کے پرنٹس، گاڑی کی نمبر پلیٹ کا ڈیٹا اور سب کچھ موجود تھا۔ کیس بہت صاف اور واضح تھا۔ یہ نیمل کی زندگی کی سب سے بڑی اور سب سے مشکل جنگ تھی۔ ایک طرف اس کا شوہر تھا اور دوسری طرف اس کا ضمیر اور قانون کا وہ ترازو تھا جس کی قسم اس نے کھائی تھی۔

"تمہیں کسی بھی طرح زوریز کو بچانا ہوگا، نیمل..." شاہ زیب سلطان کی آواز میں ایک بیوروکریٹ کے بیٹے کا وہ روایتی دباؤ اور بدحواسی تھی جو قانون کو اپنے گھر کی لونڈی سمجھتا ہے۔ "بس ایک بار... بس ایک بار وہ ضمانت پر باہر نکل آئے، اس کے بعد ڈیڈ خود سب کچھ دیکھ لیں گے۔ ہمارے پاس ہائی کورٹ کے ججز تک رسائی ہے۔"

زوریز سلطان... بیوروکریٹ سلطان احمد کا چھوٹا بیٹا! اور اس بیوروکریٹ کے اکیس سالہ بیٹے نے ایک معصوم، بے گناہ لڑکی کو اغوا کیا، اسے وحشیانہ جنسی تشدد کا نشانہ بنایا اور پھر اسے کچرے کے ڈھیر پر مار کر پھینک دیا۔ فائل کے صفحات پلٹتے ہوئے نیمل کے جبڑے بری طرح بھنچے ہوئے تھے۔ اس کے مہندی لگے ہاتھوں میں شدید کپکپاہٹ تھی۔ یہ ہاتھ اس ظلم کی تفصیلات پڑھتے ہوئے کانپ رہے تھے یا اس مرد کے بدلتے روپ کو دیکھ کر، جو اس کا شوہر بن چکا تھا۔ وہ فیصلہ نہیں کر پائی۔ اس سے پہلے نیمل کچھ کہتی شاہ زیب کی جیب میں رکھا مہنگا فون دگنی شدت سے بج اٹھا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے اسکرین دیکھی اور فوراً کان سے لگایا۔

"جی ڈیڈ..." شاہ زیب کی آواز میں بدحواسی تھی۔"جی جی...نیمل یہیں میرے سامنے ہے۔وہ فائل دیکھ رہی ہے۔آپ فکر نہ کریں ڈیڈ، وہ ایک بہترین کرمنل لائیر ہے۔آج ہی ضمانت ہو جائے گی۔قانون میں کوئی نہ کوئی لوپ ہول تو مل ہی جائے گا۔"

شاہ زیب کا یہ جملہ سماعت سے ٹکراتے ہی نیمل کے اندر کا سارا ضبط بارود بن کر پھٹ گیا۔وہ ایک جھٹکے سے اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

اسکے بال الجھے جوڑے میں بندھے ہوئے تھے۔اس کی آنکھوں میں اس وقت غصے،صدمے اور شدید کرب کی نمی تیر رہی تھی۔وہ حیرت اور وحشت سے شاہ زیب کو دیکھ رہی تھی جو یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کا بھائی ایک ریپسٹ اور ایک بے رحم قاتل ہے،اسے محض اپنے خاندانی نام،اپنے باپ کے بیوروکریٹک غرور اور پیسے کی قیمت پر قانون کا گلا گھونٹ کر بچانا چاہتا تھا۔

"میں یہ نہیں کر سکتی..."نیمل کی آواز بند کمرے کی دیواروں سے ٹکرائی۔

شاہ زیب نے چونک کر فون کان سے ہٹایا اور حیرت زدہ نظروں سے اسے دیکھا۔" کیا...کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ شاہ زیب سلطان صاحب! میں ایک قاتل اور ایک ریپسٹ کے لیے عدالت کے کٹہرے میں کھڑی نہیں ہو سکتی۔میں اس قانون کا مذاق نہیں اڑا سکتی جس کے سر پر ہاتھ رکھ کر میں نے سچائی کا حلف اٹھایا تھا۔"نیمل کا لہجہ دوٹوک تھا جس نے شاہ زیب کے چہرے کا رنگ اڑا دیا۔

"نیمل،تم پاگل ہو گئی ہو؟"شاہ زیب غصے سے میز پر جھکا،اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔"وہ میرا سگا بھائی ہے! وہ تمہارا دیور ہے! ہماری خاندانی عزت،میرے باپ کا کیریئر،سب کچھ اس ایک کیس سے جڑا ہوا ہے۔تم ایک وکیل ہو،وکیلوں کا کام مجرموں کو بچانا بھی ہوتا ہے۔"

"وکیلوں کا کام بے گناہوں کے لیے لڑنا ہوتا ہے،شاہ زیب! ایسے درندوں کے لیے نہیں۔"نیمل نے فائل کو جھٹکے سے بند کیا،جس کی آواز کمرے میں گونج گئی۔اسکا چہرہ سرخ پڑ چکا تھا۔

"تم جانتی ہو تم کیا کہہ رہی ہو؟" شاہ زیب ابھی تک صدمے کی سی کیفیت میں تھا۔ اسے وکیلوں کی کمی نہیں تھی لیکن اسے یہ امید نہیں تھی کہ نیمل اسے یوں انکار کر دے گی۔ نیمل اسکا ساتھ نہیں دے گی۔

"میں اپنے ہوش وحواس میں ہوں اور میں جانتی ہوں میں کیا کہہ رہی ہوں۔" نیمل نے شاہ زیب کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا جبکہ شاہ زیب ابھی صدمے کی سی کیفیت میں اسے سیکھ رہا تھا۔

"میں تمہارا شوہر ہوں نیمل! تم..تمہیں..."

"آپ کی بیوی ہونے سے پہلے میں ایک عورت ہوں اور ایک عورت ذات کے ساتھ ہوئے ایسے گھناؤنے ظلم پر کسی مرد کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ یہ شہر بہترین وکیلوں سے بھرا پڑا ہے۔ آپ اپنے بھائی کو بچانے کے لیے جو چاہے مرضی کریں میں آپ کو نہیں روکوں گی لیکن اس میں، میں آپکا ساتھ نہیں دوں گی۔ ایم سوری..." نیمل نے سنجیدگی سے کہتے رخ موڑ لیا۔ شاہ زیب کے ہونٹ بھنچ گئے۔ اس نے ایک نظر نیمل کی پشت دیکھی اور پھر فائل اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اسکے پیچھے دروازہ زور سے بند ہوا تھا۔ اسکے جاتے ہیں جیسے نیمل کی ٹانگیں جواب دے گئیں۔ وہ گرنے والے انداز میں کرسی پہ ڈھے گئی۔ اس نے اپنا سر پکڑ لیا۔ دماغ جیسے کام کرنا چھوڑ چکا تھا۔ اس نے خالی خالی نظروں سے دروازے کی جانب دیکھا جس کے باہر اسکے گھر والے انتظار کر رہے تھے اور پھر وہ اٹھ کر شکستہ قدموں سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆...☆...☆

شنگیر ہاؤس میں اس وقت کا منظر کسی بھی شادی والے گھر سے یکسر مختلف تھا۔ رخصتی کا وقت قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا، کارڈ بٹ چکے تھے، دور دراز کے مہمانوں نے رخصتی دیکھنے کے لیے اپنے قیام کا دورانیہ بڑھا لیا تھا، اور یہاں... یہاں قیامت برپا تھی۔ ثریا چچی آئی ہوئی تھیں۔ زہرہ بیگم ان کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پہ بیٹھی تھیں۔ دادی بھی وہیں تھی۔

"برا مت مانیے گا بھابھی لیکن ایسے امیر خاندانوں میں ایسی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ رشتہ ہمیشہ اپنے برابر کے لوگوں میں کرنا چاہیے۔"

زہرہ بیگم کچھ نہ بولیں وہ خاموشی سے سنتی رہیں۔ سرمد صاحب لاؤنج کے وسط میں کھڑے تھے، فون کان سے لگائے وہ کسی سے بحث کر

رہے تھے،ان کا ماتھا پسینے سے شرابور تھا۔

اور نیمل؟ نیمل اس وقت ایک ایسی کشتی پر سوار تھی جو بیچ بھنور میں پھنس چکی تھی۔ایک جانب شاہ زیب تھا،جس کے ساتھ اس نے کل رات زندگی کے نئے سفر کا حلف لیا تھا اور دوسری جانب اس کا ضمیر اور پیشہ تھا۔وہ مطمئن تھی کہ زوریز کو سزا ملنی چاہیے لیکن اس کے اپنے دل میں شاہ زیب کے لیے موجود جذبات اسے دولخت کر رہے تھے۔

"ایم سوری آپی..." تارہ نیمل کے کمرے میں آئی تھی۔

" کس لیے؟" نیمل نے حیرت سے اسے دیکھا اور اسکا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھایا۔تارہ تھوڑی گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔

" آپ ہمیشہ کہتی ہیں کہ مرد دوست نہیں ہوتا۔مردوں سے دوستی نہیں کرنی چاہیے۔فاصلہ رکھنا چاہیے اور..." تارہ کی آواز رندھ گئی۔وہ کسی بھنور میں پھنسی تھی۔نیمل سمجھ سکتی تھی اس نے ماں بن کر پالا تھا اپنے بہن بھائیوں کو۔

" کل میں نے جب زوریز کو فنکشن پہ دیکھا تو وہ مُجھے بہت کول لگا۔اچھا لگا۔میں نے سوچا کہ..." تارہ کی آواز رندھ رہی تھی۔وہ خوفزدہ تھی۔نیمل توجہ سے اسے سن رہی تھی۔وہ اسکا ہاتھ، ہاتھ میں لیے سہلا رہی تھی۔وہ اسے بولنے دینا چاہتی تھی۔

"زوریز نے مُجھے اپنا نمبر بھی دیا۔مُجھے لگا تھا ہم اچھے دوست بن سکتے ہیں۔ایم سوری..مُجھے نہیں پتا تھا وہ ایسا ہے..." آخری بات کرتے وقت تارہ رو دی۔وہ بہت خوفزدہ تھی۔نیمل نے بے ساختہ اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔جو لڑکی اس حادثے کا شکار ہوئی تھی وہ تارہ کی ہی ہم عمر تھی اور نیمل یہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

"اٹس اوکے ہنی! میں نہیں کہہ رہی کہ زوریز برا ہے ہاں پر اس نے بہت برا کیا ہے۔تمہاری کوئی غلطی نہیں ہے۔" وہ اسے بازوؤں میں لیے تھپک رہی تھی اور تارہ کے اندر جو صبح سے غبار بھرا تھا وہ آہستہ آہستہ بہہ رہا تھا۔اسکی شخصیت نوفہ سے قدرے مختلف تھی مگر اس وقت وہ بہت خوفزدہ لگ رہی تھی۔باہر سرمد صاحب نے فون بند کیا اور نیمل کے کمرے کی طرف بڑھے۔

"نیمل..." انہوں نے دروازے پر کھڑے ہو کر پکارا۔نیمل نے تارہ کے آنسو صاف کرتے ہوئے سر اٹھایا۔

"سلطان صاحب کا فون تھا۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ تم اب اس خاندان کا حصہ ہو، اور تم ایک وکیل ہو۔ تمہیں اب اس خاندان کے لیے کھڑا ہونا چاہیے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ وقت تمہارے پروفیشنلزم کا نہیں بلکہ تمہاری وفاداری کا امتحان ہے۔"

"میں اس گھر کی بہو ہوں لیکن میں کسی مجرم کی وکیل نہیں بن سکتی۔ وفاداری انسان کے ضمیر سے شروع ہوتی ہے، خاندان کی دہلیز سے نہیں۔ شاہ زیب کے بھائی نے جس لڑکی کو قتل کیا ہے، وہ بھی کسی کی بیٹی تھی۔ اگر میں اپنی شادی بچانے کے لیے اس ظلم پر خاموش ہوگئی، تو کل کو میں اپنے ہی ضمیر کو کیا جواب دوں گی؟ میں ان کے خاندان کے ساتھ ہوں ابا، ان کے جرم کے ساتھ نہیں۔"

سرمد صاحب کا دل پل بھر کو فخر سے بھر گیا مگر وسوسے ان کے دل میں گھر کر چکے تھے۔ جانے آگے کیا ہونے والا تھا۔

ادھر سلطان ہاؤس کا منظر بھی کچھ مختلف نہیں تھا۔ وہاں بھی شادی کا ماحول تھا لیکن خوشی کی جگہ خوف و ہراس نے لے لی تھی۔ مسز سلطان ایک صوفے پر نیم دراز، اپنے بیٹے کی گرفتاری پر زار و قطار رو رہی تھیں۔ ہر کوئی جانتا تھا کہ آج بیوروکریٹ سلطان احمد کے بیٹے کی شادی تھی مگر آج پورا شہر ان کے چھوٹے بیٹے کے مکروہ جرم کا چرچا کر رہا تھا۔ سلطان احمد کمرے میں طیش کے عالم میں چہل قدمی کر رہے تھے۔ وہ فون پر اعلیٰ حکام کو دھمکیاں دے رہے تھے اور کبھی منتیں کر رہے تھے۔ شاہ زیب جس کے ہاتھ میں ابھی تک کل رات کی انگوٹھی چمک رہی تھی، ایک کونے میں پتھر کی طرح ساکت کھڑا تھا۔

سلطان احمد نے فون پھینکا اور شاہ زیب کی طرف مڑے۔ "نیمل کا کیا جواب ہے؟"
شاہ زیب نے اپنی ماں کی طرف دیکھا، پھر باپ کی طرف۔ اس کا گلا خشک تھا۔

"وہ... وہ اس کیس میں ہماری مدد کرنے سے انکار کر رہی ہے، ڈیڈ۔"

سلطان احمد کی آنکھوں میں غصہ اور تکبر کا ایک طوفان امڈ آیا۔ "انکار؟ وہ جس دن اس گھر کی بہو بنی ہے، وہ اس کی پابند ہے۔ خیر سیکھ جائے گی۔ شاہ زیب! تم اپنی بیوی کو سنبھالو۔ اور زوریز آج شام تک ضمانت پر باہر آ جائے گا۔" انہوں نے اپنی بیوی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم لوگ بارات کی تیاری کرو، شادی نہیں رکے گی۔"

وہ حکم صادر کر کے کمرے سے باہر نکل گئے۔ شاہ زیب وہیں کھڑا رہ گیا۔اس کے ذہن میں ایک طرف اس کا زوریز تھا،جس کی ہتھکڑیاں اسے بار بار تڑپا رہی تھیں،اور دوسری طرف نیمل تھی جس کے ساتھ وہ اپنی پوری زندگی گزارنا چاہتا تھا۔اسے خوف بھی تھا کہ اگر آج اس نے باپ کا ساتھ دیا تو نیمل اسے ہمیشہ کے لیے کھودے گی اور اگر نیمل کا ساتھ دیا تو اس کا پورا خاندان اسے غدار قرار دے دے گا۔باہر میڈیا کا ہجوم بارات کی کوریج کے لیے جمع تھا اور اندر خاندان ایک اندھی کھائی میں گر رہا تھا۔جانے قسمت کیا گل کھلانے والی تھی؟

☆...☆...☆

اوپری منزل پہ واقع کمرے میں صرف چار لوگ تھے...سرمد صاحب،سقراط،سلال اور نیمل۔مرکز میں رکھا شیشے کا ٹیبل خاموش تھا مگر اس کے گرد بیٹھے چاروں وجود اپنے اپنے اندر ایک قیامت اٹھائے ہوئے تھے۔کئی لمحے کسی نے ایک لفظ نہ بولا۔آخر سرمد صاحب نے دونوں ہاتھ آپس میں بھینچتے ہوئے خاموشی توڑی۔

"ایک بات طے کرنی ہوگی...کیا رخصتی روک دی جائے؟"

یہ سوال ہوا میں معلق رہ گیا۔سلال نے بے اختیار سر اٹھایا۔

"میرا دل کہتا ہے روک دیں۔ایسے حالات میں آپی کو رخصت کرنا...مُجھے ٹھیک نہیں لگ رہا۔کل تک وہ لوگ ہمارے لیے بہترین خاندان تھے...اور آج ان کے گھر سے ایک قاتل نکلا ہے۔"

کمرے میں پھر خاموشی چھا گئی۔سقراط اپنی جگہ خاموش بیٹھا تھا۔اس نے انگلیاں آپس میں پھنسا رکھی تھیں۔چند لمحوں بعد وہ دھیرے سے بولا۔

"فیصلے غصے میں نہیں کیے جاتے،خاص طور پر وہ فیصلے جن کے اثرات پوری زندگی پر پڑتے ہوں۔"اس کی نظریں سرمد صاحب پر تھیں۔

"سوال صرف زوریز کا نہیں ہے...سوال یہ ہے کہ کیا شاہ زیب بھی اپنے بھائی جیسا انسان ہے؟"

نیمل نے فوراً سر اٹھایا۔ "نہیں۔"

تینوں نظریں ایک ساتھ اس پر اٹھیں۔ نیمل نے گہرا سانس لیا۔

"وہ غلط کر رہا ہے... بہت غلط۔ مگر وہ اپنے بھائی کو بچانے کی کوشش کر رہا ہے۔"

"ایک قاتل کو بچانے کی کوشش بھی تو جرم ہی ہے۔" سلال بے اختیار بول اٹھا۔

"بالکل ہے۔" نیمل نے فوراً مان لیا۔ "اور اسی لیے میں اس کا کیس نہیں لڑوں گی۔ کبھی نہیں۔"

کمرے میں بیٹھے تینوں مرد خاموشی سے اسے سنتے رہے۔ نیمل کی نظریں اب کھڑکی سے باہر کہیں دور تھیں۔

"لیکن میں ایک اور حقیقت بھی جانتی ہوں..." وہ آہستہ سے بولی۔ "آج اگر میں صرف اس حادثے کی وجہ سے رخصتی روک دیتی ہوں تو اس وقت شاہ زیب بالکل تنہا رہ جائے گا۔ اس کا بھائی جیل میں ہے... اس کا باپ طاقت کے نشے میں اندھا ہو چکا ہے... اس کی ماں ٹوٹ رہی ہے... اور میں... میں اس کی شریکِ حیات ہوں۔"

سرمد صاحب خاموشی سے اپنی بیٹی کو دیکھتے رہے۔ نیمل کی آواز مزید نرم ہو گئی۔

"شریکِ حیات ہونے کا مطلب ہر غلط کام میں ساتھ دینا نہیں ہوتا... لیکن ہر آزمائش میں ساتھ چھوڑ دینا بھی نہیں ہوتا۔"

سقراط کی نگاہوں میں ہلکی سی تحسین ابھری۔ اسے نیمل سے ایسے ہی کسی عقل مند فیصلے کی امید تھی۔

"اگر میں آج رخصت ہوتی ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ میں زوریز یا انکل سلطان کے ساتھ ہوں۔ میں صرف اپنے شوہر کے ساتھ کھڑی ہوں... اس امید کے ساتھ کہ شاید وہ ایک دن صحیح اور غلط کے درمیان فرق کرنا سیکھ لے۔"

سلال نے خاموشی سے سر ہلایا۔سرمد صاحب نے لمبی سانس خارج کی۔

"لیکن لوگ...؟" وہ تلخی سے مسکرائے۔"پورا شہر یہی کہے گا کہ سرمد نے اپنی بیٹی ایسے گھر بھیج دی جہاں..."

"لوگ کل بھی بولتے تھے ابا...اور کل بھی بولیں گے اگر رخصتی نہ ہوئی۔"

خاموشی پھر سے کمرے میں اتر آئی۔چند لمحوں بعد سقراط اپنی جگہ سے اٹھا۔اس نے سرمد صاحب کی طرف دیکھا۔

"میں نیمل کی بات سے اتفاق کرتا ہوں۔" وہ ٹھہر کر بولا۔"رخصتی روکنے سے صرف ایک بحران دوسرے بحران میں بدل جائے گا۔"

سرمد صاحب نے آنکھیں بند کر کے چند لمحے سوچا۔پھر انہوں نے دھیرے سے سر ہلا دیا۔

"ٹھیک ہے..." ان کی آواز بوجھل تھی۔"رخصتی آج ہی ہوگی۔" یہ فیصلہ سناتے ہوئے ان کا گلا بھر آیا۔"لیکن ایک بات یاد رکھنا، بیٹیاں رخصت ہوتی ہیں، بے گھر نہیں ہوتیں۔یہ گھر ہمیشہ تمہارا رہے گا۔"

نیمل کی آنکھیں بھیگ گئیں۔اس نے خاموشی سے اپنے باپ کا ہاتھ تھام لیا۔سقراط جا چکا تھا جبکہ سلال دھیرے سے مسکرا دیا۔

☆...☆...☆

شام کے سائے گہرے ہوتے ہی آسمان پر ایک زرد رنگت پھیل گئی تھی۔یہ وہ شام تھی جس کے استقبال کے لیے شبگیر ہاؤس مہینوں سے سج رہا تھا مگر آج جب وہ وقت آیا تو فضا میں کوئی ترنگ تھی نہ کوئی شہنائی۔جس بارات کو بینڈ باجے، دھوم دھام اور ڈھولک کی تھاپ پر شاہانہ جاہ وجلال کے ساتھ آنا تھا، وہ حد درجہ سادگی اور خاموشی سے ہال کی دہلیز پر آ اتری۔عروسی جوڑے میں ملبوس، اپنے ہی ہاتھوں کی حنائی خوشبو سے دم گھٹتی دلہن بنی نیمل کے چہرے کی تمام رمک مرجھا چکی تھی۔اس کے سرخ گالوں پر پیلاہٹ تیر رہی تھی اور اس کی آنکھیں اب کسی ویران جھیل کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ کئی ہولناک خدشات، وسوسے اور ان کہے خوف کسی مہیب اژدھے کی مانند پھن پھیلائے اس کے

نازک کندھوں پر بیٹھے تھے، جن کا بوجھ اس سے اٹھائے نہیں اٹھ رہا تھا۔ کیا وہ ایک ایسے گھر جا رہی تھی جہاں درندگی کا سایہ تھا؟ کیا شاہ زیب کبھی اسے معاف کر پائے گا؟ کیا شاہ زیب اسے دل سے قبول کرے گا؟ وہ اپنی ہی سوچوں سے تنگ آ گئی تھی۔

گھر کے باقی افراد کے چہروں پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ایک دم گھونٹتا ہوا تناؤ ہر وجود پر مسلط تھا۔ اس کے باوجود، شبکیر خاندان نے اپنی روایتی شرافت اور خاندانی وقار کا بھرم رکھتے ہوئے آگے بڑھ کر بارات کا استقبال کیا۔ شاہ زیب سہرے کے بغیر، بالکل سپاٹ اور منجمد چہرے کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اس کی آنکھوں کی وہ چمک جو کل رات تک نیمل کے لیے تھی اب ایک گہرے صدمے کی راکھ میں بدل چکی تھی۔

نکاح چونکہ پہلے ہی ہو چکا تھا، اس لیے اب صرف رخصتی کی چند رسمی گھڑیاں باقی تھیں۔ نیمل کو لا کر اسٹیج پر شاہ زیب کے برابر بٹھا دیا گیا۔ دونوں ایک دوسرے کے اتنے قریب تھے مگر ان کے درمیان جیسے صدیوں کا فاصلہ حائل ہو چکا تھا۔

شاہ زیب کے سوٹ کی اندرونی جیب میں رکھا اس کا فون سائلنٹ پر تھا مگر اس کی اسکرین مسلسل جل بجھ رہی تھی۔ کبھی اس کے قریبی احباب کا فون آ رہا تھا، کبھی وکلاء کے پیغامات اور کبھی میڈیا کے نمائندوں کی کالز۔ شاہ زیب اس جلتی بجھتی اسکرین کو دیکھتا، تو اس کے جبڑے مزید بھنچ جاتے۔ وہ سب کے سامنے خود کو نارمل دکھانے کے لیے بار بار اپنے لبوں پر مصنوعی مسکراہٹ لانے کی کوشش کرتا، مگر وہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر آنے سے پہلے ہی دم توڑ جاتی۔ وہ اپنے ہی وجود میں ایک قیدی بن چکا تھا۔ نیمل بالکل ساکت بیٹھی سامنے دیکھ رہی تھی۔ اس نے شاہ زیب کے چہرے کی بدحواسی کو دیکھا، مگر اس کے لبوں سے ہمدردی کا ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ اسکی زبان تالو سے جا چپکی تھی۔ پہلو میں بیٹھا شخص اسکا شوہر تھا مگر چند گھنٹے بعد اسکے ساتھ کیسا سلوک کرتا وہ یہی سوچے جا رہی تھی۔ پورے ہال میں موجود مہمانوں کے درمیان کٹیلی چہ میگوئیاں اور سرگوشیاں عروج پر تھیں۔ طرح طرح کی باتیں بن رہی تھیں۔

"دیکھو ذرا... دولہے کا بھائی ریپسٹ اور قاتل نکلا اور یہ لوگ ایسے بیٹھے ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔"

"بچاری لڑکی... رخصتی کے دن ہی کیسی بدنامی کا طوق گلے میں پڑ گیا۔"

"تو لڑکی کا خاندان کونسا صاف ستھرا ہے؟ دلہن کے چاچو نے بھی تو یہی کیا تھا۔"

لوگوں کی نظریں نیمل اور شاہ زیب کو تپتے ہوئے کوئلوں کی طرح جھلسا رہی تھیں۔

اس تمام تماشے سے دور، ہال کے اندر پھیلی اس زہریلی فضا سے خود کو بچانے کے لیے سقراط منظر نامے سے ہٹ چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ ہال کے اندر جاتا، تو لوگ اس کے ماضی اور اس کے پرانے حادثات کو اکھاڑ کر باتیں بنانا شروع کر دیتے۔ ایسے نازک موقعوں پر تماشائیوں کو پرانے زخم کریدنے کا اچھا موقع مل جاتا ہے اور یہ بھی ممکن تھا کہ اس ہولناک صورتحال میں شاہ زیب کے گھر والے اس کی موجودگی کا برا مان جاتے۔ وہ نیمل کے لیے مشکل نہیں بننا چاہتا تھا۔ مگر دوسری طرف نیمل تھی... اس کی لاڈلی بھتیجی، وہ نیمل کو اس دنیا میں سب سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ کیا وہ اپنی انا اور لوگوں کے ڈر سے اس کی رخصتی جیسے اہم ترین لمحے میں اس کے ساتھ نہ کھڑا ہوتا؟ اسی شدید ذہنی اور جذباتی کشمکش کا شکار سقراط، شادی ہال کے عین سامنے سڑک کے پار بنے ایک پرسکون ریستوران کی شیشے والی کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا۔ میز پر چائے کا کپ ٹھنڈا ہو رہا تھا اور اس کی گہری نظریں سڑک پار کھڑی گاڑیوں کی قطاروں اور ہال کے چمکتے ہوئے اس بیرونی گیٹ پر جمی تھیں جہاں سے نیمل نے کچھ دیر بعد رخصت ہونا تھا۔ وہ ابھی دل اور دماغ کے اسی ہولناک دلدل میں پھنسا ہوا تھا کہ میز پر رکھا اسکا فون تیز وائبریشن کے ساتھ بج اٹھا۔ اسکرین پر سلال کا نام چمک رہا تھا۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے فون کان سے لگایا۔

"چاچو! آپ کہاں ہیں؟" دوسری طرف سے سلال کی ہانپتی ہوئی آواز آئی۔ "رخصتی کا وقت ہو چکا ہے۔ نیمل بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہی ہے، وہ آپ کا پوچھ رہی ہے چاچو... پاپا بھی بہت پریشان ہیں۔ پلیز، آپ جہاں کہیں بھی ہیں، جلدی آ جائیں۔ نیمل آپ کے بغیر یہاں سے قدم نہیں اٹھائے گی۔"

سلال کی بات پر اس کے چہرے کی سرد مہر سختی پل بھر میں پگھل گئی۔ دل اور دماغ کی اس جنگ میں، ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اس کا دل جیت گیا تھا۔ اس نے نیمل کے لیے اپنے تمام خدشات کو پسِ پشت ڈال دیا۔ والٹ جیب میں ڈالا، کرسی پیچھے دھکیلی اور تیز قدموں کے ساتھ ریستوران سے نکل کر سڑک پار کرتے ہوئے مارکی کی طرف بڑھ گیا۔ ہال کے اندر ایک خاموش گوشے میں زہرہ بیگم صوفے پر بیٹھی تھیں۔ ان کا دل بار بار گھبراہٹ کا شکار ہو رہا تھا۔ صبح جب سے انہوں نے زوریز کی گرفتاری اور اس گھناؤنے کیس کی خبر سنی تھی، ان کی اپنی طبیعت شدید ناساز ہو چکی تھی، بلڈ پریشر اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ نیمل کا فیصلہ ایک طرف درست تھا مگر اندر ہی اندر انہیں عجیب خوف ستا رہا تھا۔ لیکن وہ خود پر زبردستی قابو پائے ہوئے صوفے کا سہارا لیے بیٹھی تھیں۔ ان کا چہرہ زرد تھا اور وہ دل ہی دل میں نیمل کے نصیب کے لیے دعائیں پڑھ رہی تھیں۔

سلال ہال کے اندر ہر کام کو بہترین بنانے میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ ہر ممکن کوشش کر رہا تھا کہ شاہ زیب کی فیملی کو کسی بھی بات کا برا نہ لگے۔ وہ بارتیوں کے آگے پیچھے پھر رہا تھا اور جب کبھی اس کی نظر اسٹیج پہ بیٹھی نیمل پر پڑتی اسکا دل بھر آتا۔ اسکی بہن چند گھڑیوں بعد جانے والی تھی۔ بچپن سے لے کر اب تک کے بہت سارے مناظر اسکی آنکھوں کے سامنے گھوم رہے تھے مگر اپنے تمام جزبات کو اپنے سینے کے تہہ خانے میں

دفن کر رہا تھا تا کہ اس کی بہن کی رخصتی میں کوئی کسر باقی نہ رہے۔
رخصتی کا وقت اب سر پر آ چکا تھا اور ہال کے دروازے پر جیسے ہی سقراط کا وجود نمودار ہوا، نیمل کی مرجھائی ہوئی آنکھوں میں پل بھر کے لیے چمک ابھری۔ سقراط کا ہونا اسے حوصلہ دلاتا تھا۔ اسٹیج پر بیٹھے شاہ زیب سلطان کی متجسس نظریں اپنے باپ کی طرف سے ہٹ کر سقراط پر جم گئیں۔ سقراط کو دیکھتے ہی شاہ زیب کے جبڑے بھیانک حد تک بھنچ گئے۔ اس کی آنکھوں میں نفرت اور انتقام کا سرخ انگارہ دہک اٹھا۔ اس نے تپتے ہوئے سانسوں کے ساتھ نیمل کی طرف رخ کیا، اور دانت پیستے ہوئے دھیمی مگر زہریلی آواز میں پوچھا۔

"یہ یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

" کیا مطلب؟" نیمل نے چونک کر شاہ زیب کی سلگتی ہوئی نظروں کے تعاقب میں دیکھا، جہاں سقراط اس کی جانب آگے بڑھ رہا تھا۔
نیمل نے حیرت سے الٹا سوال کیا، "وہ میرے چاچو ہیں۔ کیوں نہ آئیں وہ؟"

"ایک ریپسٹ ہماری شادی میں کیا کر رہا ہے، نیمل؟"

شاہ زیب کا لہجہ طنز کے نشتر میں ڈوبا ہوا تھا اور اس کا چہرہ اس وقت غصے سے تانبے کی طرح سرخ پڑ چکا تھا۔ اس کے اپنے بھائی کے کیس میں نیمل نے قانون اور اخلاقیات کا بھاشن دے کر صاف انکار کر دیا تھا، اور یہاں... یہاں اس کے اپنے گھر میں، اس کے اپنے خاندان میں ایک ایسا گنہگار گھوم رہا تھا جس پر دنیا تھوکتی تھی۔

" کیسی فضول باتیں کر رہے ہیں شاہ زیب آپ؟" نیمل کے چہرے کے تاثرات یکلخت بگڑ گئے۔ اس کے ماتھے پر غصے کی لکیریں ابھریں۔

"ان ریپسٹ کہو کہ وہ یہاں سے اسی وقت چلے جائیں!" وہ حکمیہ لہجے میں بولا۔

نیمل پل بھر کو بالکل ساکت رہ گئی۔ اس نے زندگی کے بدترین خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ رخصتی کے دن، اسٹیج پر بیٹھا اس کا شوہر اس کے سب سے پیارے رشتے کے بارے میں یہ زبان استعمال کرے گا۔

"شاہ زیب آپ..." نیمل صدمے کی سی کیفیت میں تھی۔

"اگر میرا بھائی گنہگار ہے اور بقول تمہارے وہ ایک درندہ ہے تو تمہارا چاچو کیا ہے؟" شاہ زیب نے اس کے لفظوں کو اسی کے منہ پر مارا۔ "وہ بھی تو اسی قبیلے کا ہے نا؟ پھر اس کے لیے یہ سرخ قالین کیوں؟"

نیمل ساکت و جامد بنی بے یقینی سے اسے دیکھے گئی۔ اس کے اندر کا قانون دان اس بے بنیاد موازنے پر تڑپ اٹھا۔ اور تب ہی شاہ زیب ایک شدید جھٹکے سے اسٹیج پر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے یوں اچانک اور غصے سے اٹھنے پر اسٹیج کے پاس کھڑی نامرہ اور تارہ بری طرح چونک گئیں۔ دور بیٹھی زہرہ بیگم کا دل جیسے پتا بن کر کانپ اٹھا۔ ہال کے اس حصے میں موجود چند قریبی مہمانوں کی سرگوشیاں یکلخت تھم گئیں۔

"شاہ زیب..." نیمل بھی فوراً کھڑی ہوئی۔ اس کے بھاری لہنگے کے گھیرے نے اسٹیج کی زمین کو چھوا۔ وہ ہراساں نظر آتی تھی۔ وہ یہاں کوئی تماشہ نہیں چاہتی تھی۔

"نیمل انہیں یہاں سے دفع کرو..." شاہ زیب کی آواز اونچی ہوئی۔ قدم بڑھاتا سقراط وہیں ٹھہر گیا۔

"شاہ زیب! میرے خاندان کے بارے میں تمیز سے بات کریں۔" نیمل کی آواز میں دبی دبی غصے کی تھرتھراہٹ تھی۔

"واؤ! حد ہے منافقت کی..." شاہ زیب نے تمسخرانہ کہتے ہوئے ہوئے اپنے کوٹ کے بٹن کھولے۔ "تم میرے منہ پر میرے سگے بھائی کو درندہ بولو، اور میں تمہارے پاک باز خاندان کے بارے میں سچ بھی نہ کہوں؟"

آس پاس کی فضا میں اب سانس روک دینے والی خاموشی چھانے لگی تھی۔ مہمانوں کے چہروں پر حیرت اور سنسنی خیز تجسس پھیل رہا تھا۔ سلال نے جیسے ہی حالات کی سنگینی کو بھانپا، وہ تیزی سے اسٹیج کی جانب بڑھا۔

"شاہ زیب! خدا کے لیے خاموش ہو جائیں، لوگ دیکھ رہے ہیں۔" نیمل کی آنکھوں میں ضبط کی نمی ابھری۔ وہ اس رخصتی کو تماشہ نہیں بنانا چاہتی تھی۔

"میں بھی نہیں چاہتا کہ لوگ تماشہ دیکھیں۔تم اپنے اس چاچو کو یہاں سے نکالو۔ابھی اور اسی وقت!" شاہ زیب نے انگلی سے سقراط کی طرف اشارہ کیا۔نیمل کے نازک ہونٹ شدتِ ضبط سے بھینچ گئے۔اس کی روح تک اس توہین پر چھلنی ہو رہی تھی۔

"شاہ زیب بھائی! کیا ہوا ہے؟ سب ٹھیک ہے نا؟" سلال اب اسٹیج پر پہنچ چکا تھا،اس کی آواز میں التجا اور غصے کا ملا جلا امتزاج تھا۔

"تم چاہتے ہو یہاں تماشہ ہو،سلال؟" شاہ زیب نے سلال کے کالر کو درست کیا۔"اگر نہیں...تو پھر اپنے اس داغدار چاچو کو یہاں سے دھکے دے کر باہر نکال دو!مُجھے اس بات پر تب یقین آئے گا کہ تم لوگ قانون کے اتنے ہی رکھوالے ہو اور تمام ریپسٹس کو ایک جیسا سمجھتے ہو! نکالو اسے باہر!"

پورے ہال کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔لوگوں کے ہاتھ میں پکڑے کولڈ ڈرنکس کے گلاس وہیں جم گئے۔خواتین نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیے۔ سرمد صاحب جو سلطان احمد کے ساتھ ہال کے ایک کونے میں کھڑے تھے،شاکڈ رہ گئے۔سلطان احمد کا چہرہ فخر سے تن گیا جبکہ سرمد صاحب کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ تمام نظریں اب نیمل پر تھیں، جو شاہ زیب کے اس سفاک روپ کے سامنے کھڑی تھی۔

"میرے چاچو ریپسٹ نہیں ہیں،شاہ زیب سلطان!"

نیمل نے ایک ایک لفظ چبا کر تقریباً غراتے ہوئے کہا۔اس کے غصے سے کانپتے ہوئے ہاتھوں کی چوڑیوں کی تیز کھنک خاموش ہال کے چپے چپے میں کسی شیشے کے ٹوٹنے کی طرح گونج گئی۔جبکہ شاہ زیب کے چہرے پر سفاک مسکراہٹ ابھری۔اس نے ایک قدم آگے بڑھا کر نیمل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

"اگر تمہارے چاچو ریپسٹ نہیں ہیں،نیمل...تو پھر وہ جیل کیوں گئے تھے؟انہوں نے اپنا گناہ قبول کیوں کیا تھا؟ سزا کیوں کاٹی؟"

وہاں،اسٹیج سے چند فٹ دور کھڑا سقراط شبگیر اپنی جگہ پر بالکل جما ہوا تھا۔اس کا وجود اس وقت ریت کے بت کی طرح منجمد تھا۔آس پاس موجود مہمانوں کی تمام حقارت بھری،تیکھی اور زہریلی نظریں اس کے چہرے پر آ کر رک گئی تھیں۔دس سال پہلے بھی دنیا اسے اسی نظر سے دیکھتی تھی،اور آج دس سال بعد بھی تماشائیوں کا رویہ ذرہ برابر نہیں بدلا تھا۔وہ چاہ کر بھی نہ آگے بڑھ سکتا تھا اور نہ پیچھے جا سکتا تھا۔اس کے پیروں میں ماضی کی زنجیریں جیسے دوبارہ پگھل کر جم گئی تھیں۔

"میرے چاچو نے اس گناہ کی سزا بھی کاٹی ہے جو انہوں نے کبھی کیا ہی نہیں تھا۔" نیمل کے لبوں سے غصے کا لاوا ابل پڑا۔ " مگر تمہارا بھائی؟ وہ ایک ثابت شدہ درندہ ہے جس نے ایک معصوم کی جان لی ہے۔ میرے چاچو کا دامن صاف تھا اور صاف رہے گا لیکن تمہارا خاندان اب رہتی دنیا تک اس بدنامی کا طوق گلے میں سجائے پھرے گا!"

نیمل پل بھر کو بھول گئی تھی وہ کہاں کھڑی تھی۔ اس کے یہ کاٹ دار الفاظ شاہ زیب کے مردانہ غرور کو اندر تک کچل کر رکھ گئے۔ اس کا چہرہ غصے سے تپنے لگا۔ سلال نے حالات کو بے قابو ہوتے دیکھ کر نیمل کو خاموش کروانے کے لیے آگے بڑھ کر اس کا بازو تھاما۔ " آپی، پلیز! خدا کے لیے رک جائیں۔"

مگر شاہ زیب جیسے پہلے ہی سے ذہن بنا کر آیا تھا۔

"تو تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ تمہاری اپنی خالہ نے تمہارے چاچو پر جھوٹا الزام لگایا تھا؟"

نیمل ہونٹ بھینچے شاہ زیب کو دیکھ رہی تھی، جیسے وہ اس مرد کو پہلی بار دیکھ رہی ہو جس کے ساتھ اس نے زندگی گزارنے کے عہد کیے تھے۔

مہمانوں کے کٹہرے کے درمیان کھڑے سرمد صاحب اب اپنا ضبط برقرار نہ رکھ سکے۔

"سلطان صاحب! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ آپ اپنے بیٹے کو روکتے کیوں نہیں؟ یہ وقت ان سب باتوں کا نہیں ہے؟" وہ ان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولے۔

"سرمد صاحب! بچوں کو اپنے معاملات خود طے کرنے دیں۔ ہم بڑوں کو ان کے بیچ میں نہیں پڑنا چاہیے۔" سلطان احمد نے اپنے چہرے پر روایتی سختی سجائی اور انتہائی بے نیازی سے سگار کا دھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔ اس ہتک آمیز جواب نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ ہال نیمل اور شاہ زیب کے درمیان بحث خطرناک حد تک بڑھ گئی۔ سقراط ہال سے باہر جانے کے لیے جیسے ہی مڑا، نیمل کی آواز نے پورے ہال میں گونج گئی۔

"چاچو! آپ کہیں نہیں جائیں گے۔آپ کو میری قسم ہے۔"

سقراط کے قدم وہیں رک گئے۔اس نے ضبط سے آنکھیں میچ لیں۔اسکی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔اگر شاہ زیب، نیمل کا شوہر نہ ہوتا تو اس وقت اپنی ٹانگوں پہ کھڑا نہ ہوتا۔اسپیکر کے پاس بیٹھی زہرہ بیگم دونوں کے اس ہولناک تصادم کے مابین بری طرح پس چکی تھیں۔وہ چاہتی تھیں نیمل چپ ہو جائے۔عزت سے رخصتی ہو جائے۔آس پاس باتیں کرتے لوگ خاموش ہو جائیں مگر وہ نیمل کی آنکھوں میں آنسوں دیکھ کر اندر ہی اندر مر رہی تھیں۔

"مُجھے لگا تھا تم ایک با اخلاق اور پڑھی لکھی لڑکی ہو، نیمل!" شاہ زیب نے تمسخرانہ انداز میں ہاتھ اٹھائے وہ سب کے سامنے نیمل کی عزت کے پرخچے اڑا رہا تھا۔

"مُجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اپنے باقی خاندان کی طرح ہی جاہل ہو۔"

"اور مُجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اتنے بے غیرت ہو شاہ زیب سلطان! جسے اپنی بیوی کی عزت کا بھی خیال نہیں۔"

نیمل نے اس کے وار کا جواب اسی کی زبان میں دیا۔وہ چاہ کر بھی خاموش نہیں رہ پائی تھی۔

"تم جیسی لڑکی اس قابل ہی نہیں ہے کہ میری لائف پارٹنر بنے!" وہ غصے سے دانت چباتے اسکی جانب بڑھا جب عین اسی لمحے سلال آگے بڑھا۔اس نے ایک ہی جھٹکے سے نیمل کو اپنے پیچھے کیا اور شاہ زیب کے بالکل سامنے آ کھڑا ہوا۔

"اگر آپ میری بہن کو عزت نہیں دے سکتے، شاہ زیب بھائی! تو میں آپ کے ساتھ بہت برا پیش آؤں گا۔" سلال کا ضبط جواب دے دیا تھا۔

"ٹھیک کہا تم نے! رکھو اپنی اس بدتمیز بہن کو اپنے ہی پاس..."

شاہ زیب نے غصے اور نفرت کے عالم میں اپنے بائیں ہاتھ کی انگلی سے نکاح کی انگوٹھی اتاری اور اسے پوری قوت سے فرش پہ دے مارا، جس

کی آواز پورے سنسان ہال میں گونج گئی۔

"نیمل..." زہرہ بیگم کی گھٹی گھٹی آواز ابھری۔ نیمل نے تڑپ کر ان کی طرف دیکھا۔ اسکی آنکھوں میں نمی تھی جبکہ زہرہ بیگم کی آنکھوں میں التجا ہی التجا تھی۔

"تم کسی بھی خاندان کی بہو بننے کے قابل نہیں ہو۔ تم اسی قابل ہو کہ تمہاری بارات واپس چلی جائے۔"

شاہ زیب مزید زہر اگل رہا تھا۔ یہ سنتے ہی زہرہ بیگم کے دل پر جیسے کسی نے آری چلا دی۔ انہوں نے اپنے سینے کو دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا۔ پورے ہال میں مہمانوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ نیمل نے خالی، بنجر اور سپاٹ نظروں سے شاہ زیب کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں کا پانی یکلخت خشک ہو گیا۔ سلال کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے ایک جھٹکے سے آگے بڑھ کر شاہ زیب کا گریبان اپنے دونوں ہاتھوں میں دبوچ لیا۔ آس پاس موجود مہمانوں اور میڈیا کے نمائندوں کے موبائل فونز باہر نکل آئے، تصویریں اور ویڈیوز بننے لگیں۔ ہال میں شدید بدحواسی پھیل گئی۔ نیمل نے فوراً آگے بڑھ کر سلال کا بازو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"جانے دو اسے واپس، سلال! چھوڑو اس کا گریبان! یہ گندگی میرے وجود سے جتنی جلدی الگ ہو جائے، اتنا ہی بہتر ہے۔"

"میں واپس جا رہا ہوں لیکن تمہیں طلاق نہیں دوں گا۔ تم ساری عمر ذلیل ہوتی رہو گی۔" وہ سلال کے ہاتھوں سے اپنا گریبان چھڑاتے اسٹیج سے نیچے اترا۔

"خلع کے کاغذات جلد مل جائیں گے آپ کو..." نیمل ضبط سے چلائی۔

"نیمل...نہیں..."

زہرہ بیگم کے یہ آخری الفاظ منہ میں ہی دم توڑ گئے۔ ان کے ہونٹ نیلے پڑنے لگے اور ان کی آنکھیں چھت کی طرف پتھرا گئیں۔ شاہ زیب ہال کے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ جیسے ہی وہ ایگزٹ کے قریب پہنچا تو وہاں کھڑے سقراط شبگیر کے بالکل قریب جا کر رکا۔

"آج جو کچھ بھی تماشہ یہاں ہوا ہے وہ صرف تمہاری وجہ سے ہوا ہے، سقراط شبگیر! اب دیکھنا کل صبح اخبارات کی سب سے بڑی ہیڈ لائن تمہارا خاندان ہوگا۔" اس نے ایک جھٹکے سے اپنے کوٹ کو جھاڑا۔ سقراط جواب تک پتھر بنا کھڑا تھا، شاہ زیب کے بولتے ہی ہی جیسے ہوش میں آیا۔ اس نے بجلی کی سی تیزی سے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور شاہ زیب کو اس کی گردن سے دبوچ لیا۔ وہ اسے کسی جانور کی طرح گھسیٹتا ہوا ہال کے مرکزی دروازے سے باہر لے گیا اور پوری قوت سے باہر دھکا دیا۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے، اس سے پہلے کہ میں تمہاری جان لے لوں!" سقراط کی آواز نے باہر کھڑے ان کے گارڈز اور میڈیا کو بھی سکتے میں ڈال دیا۔ کچھ فاصلے پر سکتے ہیں حالت میں کھڑے سرمد صاحب کی نظر زہرہ بیگم پہ پڑی جو بشمکل سانس لینے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وہ تڑپ کر ان کی جانب بڑھے۔ اس سے پہلے کہ ہال کے اندر کوئی کچھ کہتا یا سنتا، اسٹیج کے دائیں کونے سے ایک دل دہلا دینے والی چیخ ابھری۔ زہرہ بیگم یکلخت صوفے سے نیچے قالین پر ڈھیر ہو چکی تھیں۔

"امی..." نوفہ اور نین تارہ کی وحشت ناک چیخیں ہال کے گنبد سے ٹکرائیں۔

سلال اسٹیج کی سیڑھیاں پھلانگتا ہوا پاگلوں کی طرح زہرہ بیگم کی طرف بھاگا۔ ہال میں بدترین افراتفری پھیل چکی تھی۔ لڑکے والے، سلطان صاحب اور ان کے چند حامی منہ چھپائے، آہستہ آہستہ کر کے ہال کے پچھلے دروازوں سے باہر نکلنے لگے جبکہ ہال کے وسط میں اب صرف شبگیر خاندان کا ملبہ بکھرا ہوا تھا۔ سقراط ہال کے اندر بھاگا۔ اس نے اور سلال نے مل کر زہرہ بیگم کے بے جان، نیلے پڑتے وجود کو اپنے ہاتھوں میں اٹھایا۔ نیمل اپنے بھاری عروسی جوڑے کو ہاتھوں میں سمیٹے ان کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ اس کے ماتھے کا جھومر ٹوٹ کر فرش پر بکھر چکا تھا۔

☆...☆...☆

آئی سی یو کی سفید راہداری میں اس وقت صرف موت جیسی خاموشی اور لائف سپورٹ مشینوں کے بیپ بیپ کرنے کی سرد آوازیں گونج رہی تھیں۔ باہر کا ماحول ہولناک اور پریشان کن تھا۔ اسی راہداری کے ٹھنڈے فرش پر عروسی جوڑے میں ملبوس نیمل بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھوں کی مہندی اب سیاہی مائل لگ رہی تھی اور اس کی آنکھیں سامنے سفید دیوار پر ساکت ہو چکی تھیں۔ ان آنکھوں میں اب نہ کوئی آنسو تھا، نہ کوئی التجا... وہ جیسے صدمے کے اس آخری مرحلے پر تھی جہاں انسان پتھر بن جاتا ہے۔ اس کے شانے منجمد تھے اور تمام خدشات کسی زہریلے ناگ کی طرح اس کے گرد کنڈلی مارے بیٹھے تھے۔ قریب ہی نوفہ اور تارہ دادی کے بازوؤں میں سر چھپائے بے طرح رو رہی

تھیں۔ نامرہ خود پر زبردستی قابو پائے، کانپتے ہاتھوں سے ان دونوں کو چپ کروانے کی کوشش میں مصروف تھی۔ جبکہ دادی تسبیح کے دانے گراتے ہوئے بار بار دوپٹے سے اپنی آنکھیں صاف کر رہی تھیں۔

کچھ فاصلے پر سرمد صاحب ایک بینچ پر سر جھکائے بیٹھے تھے، ان کی کمر جیسے آج ہمیشہ کے لیے ٹوٹ چکی تھی۔ ایک ہی دن میں ان کی بیٹی کی بارات پلٹ گئی اور ان کی شریکِ حیات موت اور زندگی کے دھاگے سے لٹک گئی۔ جبکہ سلال پاگلوں کی طرح بار بار آئی سی یو کا دروازہ کھول کر اندر جھانکتا اور باہر نکلتے ڈاکٹروں کو روک روک کر یہی پوچھتا۔

"میری مدر کیسی ہیں؟ ڈاکٹر پلیز کچھ بولیں!" مگر ہر ڈاکٹر سر ہلا کر آگے بڑھ جاتا۔ وہ بھی خود بھی میڈیکل کا اسٹوڈنٹ تھا اور اندر کہیں جانتا تھا کہ زہرہ بیگم کی حالت کافی تشویش ناک تھی۔ ان سب سے دور، راہداری کے بالکل آخری کونے میں سقراط دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھا۔ اس کا چہرہ کرب اور شدید اذیت سے بگڑ چکا تھا، اس کے جبڑے اس حد تک بھنچے ہوئے تھے کہ گردن کی رگیں باہر کو ابھری ہوئی تھیں۔ ہسپتال کے اس سرد ماحول اور سسکتی ہوئی خواتین نے اس کے اندر کے بند دروازے کو یکلخت کھول دیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے، ہسپتال کی وہ سفید راہداری اس کی نظروں کے سامنے سے غائب ہوگ ءاور اس کی جگہ جیل کی ایک تاریک، بدبودار کوٹھڑی نے لے لی۔ دس سال پرانا ماضی اس کے ماتھے پر گرم لوہے کی طرح آ چپکا۔ وہ چھت سے الٹا ٹکا ہوا تھا۔ اس کا برہنہ جسم خون سے لت پت تھا، کوڑے اور ڈنڈے برسانے والے پولیس اہلکار اس کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ ہر ضرب پر اس کے گوشت کے چیتھڑے اڑتے تھے اور ہڈیوں کے ٹوٹنے کی آواز آتی تھی۔

"تم اپنا گناہ قبول کرلو، سقراط شبگیر! لکھو اس کاغذ پر کہ تم نے نشاط بزدار کے ساتھ درندگی کی کوشش کی ہے۔" تفتیشی افسر کی گرج دار آواز گونجی۔

"میں نے کچھ نہیں کیا... میں بے گناہ ہوں! مُجھے چھوڑ دو... خدا کے لیے مُجھے چھوڑ دو!"

وہ تڑپ رہا تھا، سسک رہا تھا، اپنے باپ اور بھائی کا نام لے کر چیخ رہا تھا مگر اس تاریک قید خانے کی دیواروں کے سوا اس کی سننے والا کوئی نہیں تھا۔ اس کی روح پر لگے وہ زخم آج دس سال بعد پھر سے ہرے ہو گئے تھے اور وہ اسی تڑپ کے ساتھ ہسپتال کے فرش پر بیٹھا ہانپ رہا تھا۔ اچانک راہداری کے فرش پر تیز قدموں کی چاپ گونجی۔ یہ چاپ اسے ماضی کی ہولناکیوں سے نکال کر حال میں لے آئی۔ سادہ سفید شلوار قمیص اور کوٹ میں ملبوس نجف بھاگتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ نجف نے دیوار سے سر ٹکائے، کرب میں ڈوبے سقراط کو دیکھا۔ ایک پل

کے لیے ان دونوں کی نظریں ملیں...سقراط کی آنکھوں میں دس سال پرانی بے گناہی کے درد کے ساتھ ساتھ کرب زرہ تپش بھی تھی اور نجف کی آنکھیں...وہ بس حیران تھیں۔ حالات کی نزاکت ایسی تھی کہ نجف بغیر رکے، تیز قدموں سے آگے بڑھ گئی۔وہ سیدھی اس جگہ پہنچی جہاں نیمل ننگے پاؤں فرش پر بیٹھی تھی۔نجف نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اپنے گھٹنے ٹھنڈے فرش پر جمائے اور آگے بڑھ کر سب سے پہلے نیمل کو دونوں کندھوں سے تھام لیا۔نیمل کا جسم اس وقت برف کی طرح ٹھنڈا ہو رہا تھا، جیسے زندگی کی آخری رمک بھی اس کے وجود سے چھین لی گئی ہو۔

"نیمل..." نجف نے اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کا زرد چہرہ تھامتے ہوئے اس کا رخ اپنی جانب موڑا۔

نیمل کی خالی پتھرائی ہوئی آنکھیں جب نجف کے چہرے پر جمیں تو نجف کا دل جیسے پسلیوں کے پیچھے تڑپ اٹھا۔اس نے نیمل کو کھینچ کر اپنے بازوؤں کے حصار میں بھینچ لیا۔اس نے نیمل کے سر پر اپنا ہاتھ رکھا اور دھیرے سے سہلایا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا...میں آ گئی ہوں نا۔میں آپا کو کچھ نہیں ہونے دوں گی۔"

نجف کا لمس، نیمل کے جمے ہوئے اعصاب پر جیسے کسی مرہم کی طرح لگا۔اسکے وجود میں جیسے جان پڑنے لگی۔

نیمل کو تسلی دینے کے بعد نجف فوراً کھڑی ہوئی اور سلال اور نامرہ کو پیچھے چھوڑتی ہوئی سیدھی آئی سی یو کے اندر چلی گئی۔وہاں موجود ڈیوٹی ڈاکٹرز سے کچھ دیر بات چیت کرتی رہی۔تھوڑی دیر بعد نجف جب باہر آئی تو اس کے چہرے پر گہری تشویش تھی۔ڈاکٹرز نے اسے زہرہ بیگم کی فائل دکھائی تھی۔

"ان کی حالت کافی تشویشناک ہے۔" ڈیوٹی کارڈیالوجسٹ نے سنجیدگی سے بتایا تھا۔ "انہیں ایک بہت بڑا کارڈیک اریسٹ ہوا ہے۔وہ پہلے ہی سے دل کی مریضہ تھیں اور اس صدمے نے ان کے دل کے پٹھوں کو ناکارہ کر دیا ہے۔ہم انہیں فوراً بزدار ہسپتال ریفر کرتے ہیں۔"

نجف نے بنا ایک سیکنڈ ضائع کیے اپنا فون نکالا اور ہسپتال کال ملائی۔وہ کچھ اہم ہدایات دے رہی تھی۔اسکے چہرے سے پریشانی نمایاں تھی۔فون بند کر کے نجف تیزی سے سلال اور سرمد صاحب کی جانب بڑھی۔

"سلال! ہمیں آپا کو یہاں سے فوراً شفٹ کرنا ہوگا۔ڈاکٹرز کا کہنا ہے ہمیں بہت جلد ہارٹ ٹرانسپلانٹ کی طرف جانا پڑ سکتا ہے۔انہیں بزدار ہسپتال ریفر کیا جا رہا ہے۔"

سلال نے نم آنکھوں کے ساتھ سر ہلایا۔سرمد صاحب کو اپنی ذاتی انا سے زیادہ اپنی بیوی عزیز تھی۔

تقریباً گھنٹے بعد زہرہ بیگم کو ہنگامی طور پر بزدار ہسپتال منتقل کر دیا گیا تھا۔جہاں وہ ڈاکٹر حق بزدار کے براہِ راست زیرِ نگرانی آئی سی یو میں داخل تھیں۔ان کی حالت تشویشناک تھی اس لیے حق بہت توجہ سے اور احتیاط سے ان کا علاج آگے بڑھا رہا تھا۔

ادھر شبگیر ہاؤس میں ویرانی کا راج تھا۔نوفہ، نین تارہ اور دادی اب گھر پر تھیں۔جبکہ ہسپتال کی اس سرد راہداری میں سرمد صاحب، سلال اور نیمل مستقل ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔نیمل اب اس زرق برق عروسی لہنگے سے نکل کر ایک سادہ، سرمئی رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھی۔ اس کے کندھوں پر ایک بڑا سیاہ دوپٹہ پھیلا ہوا تھا اور بال لاپرواہ جوڑے میں قید تھے۔اس کے چہرے پر میک اپ کا کوئی شائبہ نہیں تھا اور رونے کی وجہ سے آنکھوں کے پپوٹے بھیانک حد تک سوجھے ہوئے تھے۔ سب سے تکلیف دہ اس کے وہ ہاتھ تھے جن پر کل رات کی مہندی سجی تھی۔صابن اور اسکربر سے کھرچ کھرچ کر اتارنے کے بعد بھی، وہ مہندی اس کی جلد پر ایک بدنما داغ کی طرح لگی ہوئی تھی۔ یک ایسی شادی کی نشانی جو شروع ہونے سے پہلے ہی راکھ ہو گئی تھی۔باہر میڈیا اور اخبارات میں دھڑا دھڑ زوریز کی گرفتاری، شاہ زیب کی شادی اور شبگیر خاندان کے تماشے کی سرخیاں چل رہی تھیں۔ٹی وی اسکرینز پر نیمل اور شاہ زیب کی تصویریں آ رہی تھیں مگر شبگیر خاندان کے لیے یہ خبریں اب کوئی معنی نہیں رکھتی تھیں۔ان کے سامنے اس وقت عزت و ذلت کا نہیں بلکہ زہرہ بیگم کی زندگی کا سب سے بڑا سوال کھڑا تھا۔انہیں فرق نہیں پڑتا تھا دنیا کیا کہتی تھی، انہیں اگر کسی چیز سے فرق پڑتا تھا تو وہ صرف زہرہ بیگم کی حالت تھی۔وہ تمام بدنامیاں سمیٹ لینے کو تیار تھے، وہ تمام جہانوں کی خاک چھاننے کو تیار تھے۔بدلے میں صرف انہیں ماں واپس چاہیے تھی۔

☆...☆...☆

زہرہ بیگم کا دل اس حد تک ناکارہ ہو چکا تھا کہ ڈاکٹرز کے مطابق ہارٹ ٹرانسپلانٹ ہی واحد راستہ تھا مگر ابھی وہ فوری طور پر سرجری نہیں ہو سکتی تھی۔ان کے پھیپھڑوں کی رگوں میں خون کا دباؤ حد سے زیادہ بڑھا ہوا تھا، جس کی موجودگی میں نیا دل فوری طور پر کام بند کر سکتا تھا اور شدید صدمے کے باعث جسم میں آکسیجن کی سپلائی متاثر ہونے سے گردوں کے پیرامیٹرز (Creatinine) بگڑ چکے تھے، جن کا نارمل ہونا سرجری کے لیے لازمی تھا۔

ڈاکٹر حق کی ٹیم ان تمام مسائل کو کنٹرول کرنے کے لیے بیک اپ کی تیاریاں کر رہی تھی اور نیمل اسی تشویش کے عالم میں راہداری کے کونے

میں کھڑی فون پر گھر والوں کو ان کی خیریت بتا رہی تھی۔سلال اور سرمد صاحب نماز کے لیے گئے تھے۔وہ ابھی یہاں اکیلی تھی۔نیمل نے جیسے ہی فون بند کیا اور تھکے ہوئے وجود کے ساتھ پیچھے پلٹی،اس کے قدم وہیں ٹھہر گئے۔سامنے ڈاکٹرز کے نیلے رنگ کے سرجیکل اسکرب میں ملبوس حق کھڑا تھا۔اس کے چہرے پر سنجیدہ فکرمندی تھی۔اس کے ہاتھ میں کافی کے دو پیپر کپ تھے،جن میں سے ایک اس نے نیمل کی جانب بڑھایا۔

"شکریہ!"نیمل نے اسپاٹ لہجے میں کہا اور اپنا رخ دوسری طرف موڑ لیا۔اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ بزدار قبیلے کے کسی بھی فرد کا احسان لینے کے موڈ میں نہیں تھی۔

"مانا کہ مجھ سے ناراضی ہے تمہاری،بیلا..."حق نے اس کے اسی پرانے نام سے پکارا،وہ نام شاید نیمل شبگیر کی بھی کمزوری تھا۔"لیکن کافی سے ناراضی؟ خود کو بھوکا رکھ کر تم انکا خیال کیسے رکھ پاؤ گی؟"

نیمل کا دل یکلخت بھر آیا۔اس نے اپنے بھینچے ہوئے لبوں کو دانتوں تلے دبایا تا کہ اس کے آنسو باہر نہ نکل سکیں۔وہ اس وقت دنیا کی سب سے کمزور لڑکی لگ رہی تھی۔
حق نے ایک قدم آگے بڑھایا اور گھوم کر اس کے بالکل سامنے آ گیا۔اس نے دوبارہ کافی کا کپ نیمل کے سوجھے ہوئے چہرے کے سامنے کیا۔اس بار نیمل کے پاس انکار کی سکت نہیں تھی،اس نے کانپتے ہاتھوں سے گرم کپ کو تھام لیا۔

"تم جانتی ہو نا کہ میں اس شہر کا بلکہ اس ملک کا ایک بہترین کارڈیک سرجن ہوں؟"حق نے اپنا بایاں ہاتھ ٹراؤزر کی جیب میں ڈالا اور گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔اس کی آنکھیں اس وقت اس کے نیلے یونیفارم کے ہم رنگ لگ رہی تھیں جیسے ان میں کوئی سمندر ٹھہرا ہو۔نیمل اسے دیکھ کر رہ گئی۔ہاں یہ سچ تھا وہ ایک ماہر سرجن تھا۔

"مجھ پر اور میری ٹیم پر یقین رکھو،بیلا۔میں انہیں کچھ نہیں ہونے دوں گا۔ان کی سرجری سو فیصد کامیاب رہے گی۔یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔"

نیمل خالی نظروں سے حق کو دیکھتی رہی۔اس یقین کی اس وقت اسے سب سے زیادہ ضرورت تھی۔حق نے اسکی شادی اور شاہ زیب کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔اسے دلچسپی بھی نہیں تھی۔کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے اس نے نیمل کے ہاتھوں پر لگی مدھم مہندی کو دیکھا۔اسکے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔اس سے پہلے کہ نیمل حق کے اس دلاسے کا کوئی جواب دیتی،اچانک آئی سی یو کی طویل راہداری میں حرکت

ہوئی۔ دونوں نے بیک وقت پلٹ کر دیکھا اور دونوں کے چہروں پر یکسر حیرت پھیل گئی۔
سرمئی رنگ کے مہنگے تھری پیس سوٹ میں ملبوس امجد بزدار چلے آ رہے تھے۔ حق نے نیمل کو وہیں چھوڑا اور تیزی سے ان کی طرف بڑھ گیا۔ امجد بزدار کے چہرے پر وہی پرانی سختی تھی۔ انہوں نے ایک نظر بھی نیمل کی طرف نہیں دیکھا۔ حق ان کے قریب پہنچ چکا تھا۔

"زہرہ کی حالت کیسی ہے اب؟"

"پیچیدگیاں ہیں لیکن ہم چیزوں کو کنٹرول کر رہے ہیں۔" حق نے پیشہ ورانہ انداز میں جواب دیا۔

امجد بزدار نے ایک گہرا سانس لیا۔ وہ چند سیکنڈ کے لیے آئی سی یو کے شیشے کے پاس کھڑے ہوئے، جہاں اندر مشینوں کے حصار میں بے جان زہرہ بیگم لیٹی ہوئی تھیں۔ انہوں نے شیشے کے پار سے اس عورت کے زرد چہرے کو دیکھا جس سے کبھی ان کا نام جڑا تھا اور پھر بنا کسی سے ایک لفظ کہے، اسی سرد مہری سے پلٹے اور راہداری سے باہر چلے گئے۔ وہ اپنی برسوں پرانی خاندانی ناراضی اور انا کو ختم نہیں کر سکتے تھے مگر وہ زہرہ کو اس حال میں دیکھنے کی سکت بھی نہیں رکھتے تھے۔

نیمل کے ہاتھ میں پکڑے کافی کے گلاس پر اس کی گرفت اس حد تک سخت ہوگئی کہ کپ کا گتہ مڑ گیا۔ اس کی گلابی، سوجھی ہوئی آنکھوں میں اس وقت ایک تیز جلن ابھری۔ کیا ہوتا اگر اس شخص نے برسوں پہلے ان کی ماں سے اپنے رشتے کو یوں بے دردی سے نہ توڑا ہوتا؟ اگر امجد بزدار نے زہرہ بیگم کو خود سے کاٹ کر الگ نہ کیا ہوتا تو آج وہ دل کی مریضہ نہ ہوتیں۔ بزداروں کے دیے زخم کتنے پرانے تھے مگر ان کا زہر آج بھی تازہ تھا۔ حق ان کے پیچھے ہی راہداری سے باہر پلٹ گیا تھا اور نیمل اس سفید راہداری میں مہندی لگے ہاتھوں سے گرم کافی کا کپ پکڑے بالکل اکیلی کھڑی رہ گئی جہاں ماضی اور حال کے سائے ایک دوسرے کو کاٹ رہے تھے۔

☆...☆...☆

ملگجی شام اپنے پر پھیلائے اتر چکی تھی۔ دو دن گزر چکے تھے اور فضاجوں کی توں معلق تھی۔ نیمل اس وقت ہسپتال میں نہیں تھی۔ نین تارہ کو تیز بخار نے آگھیرا تھا جس کے باعث کچھ دیر کے لیے وہ گھر چلی گئی تھی تاکہ سنبھال سکے۔ اس وقت ہسپتال کی اس راہداری میں صرف مرد ہی رہ گئے تھے۔ سرمد صاحب نے کپکپاتے ہاتھوں سے اپنی اندرونی جیب سے چیک بک نکالی۔ انہوں نے ایک بھاری رقم کا چیک کاٹا اور سلال کی طرف بڑھا دیا۔ ان کے چہرے پر عمر بھر کی تھکن اور شکستگی کے گہرے سائے تھے۔ وہ بزداروں کا کوئی احسان نہیں لینا چاہتے تھے۔

"یہ لو سلال...جا کر ایڈوانس کاؤنٹر پر جمع کروادو۔" سرمد صاحب کی آواز جیسے کسی گہرے کنویں سے آ رہی تھی۔ وہ ٹرانسپلانٹ کی رقم پہلے جمع کروانا چاہتے تھے۔ نہوں نے اپنی زندگی کی ایک کثیر جمع پونجی نیمل کی شادی کی پہ لگائی تھی تا کہ ان کی بیٹی عزت سے رخصت ہو اور اب جو کچھ بچا تھا، وہ زہرہ بیگم کے ٹرانسپلانٹ سے پہلے ہی جمع کروا رہے تھے۔ بات رقم کی نہیں تھی بات یہ تھی کہ وہ اندر سے بالکل خالی ہو چکے تھے۔ ایک باپ کی بیٹی کی بارات واپس پلٹ جائے، شہر بھر میں انکا تماشہ بن جائے اور ان کی شریک حیات موت کے منہ میں پہنچ جائے... اس باپ کا کیا بچتا ہے؟ ان کی کمر ٹوٹ گئی تھی۔ سلال نے ابھی وہ کاغذ کا ٹکڑا اٹھایا ہی تھا کہ عقب سے سقراط کے بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ ان دونوں کے قریب آ کر رک گیا۔

"تمہیں کاؤنٹر پر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے ٹرانسپلانٹ کی پوری رقم اور ہسپتال کے باقی تمام اخراجات خود جمع کروا دیے ہیں۔ رسیدیں میرے پاس ہیں۔"

جہاں سرمد صاحب ساکت ہوئے تھے وہیں سلال کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"تمہارے پاس...اتنی خطیر رقم کہاں سے آئی؟" سرمد صاحب نے خود پر ضبط کر کے پوچھا۔ ان کے لہجے میں سقراط کے لیے ایک کڑواہٹ تھی۔ ان کی نظروں میں اس تمام بربادی، نیمل کی حالت اور زہرہ کے اس حال کا اصل ذمہ دار کہیں نہ کہیں سقراط ہی تھا اور اب وہ ان پر اپنی رقم کا احسان لاد رہا تھا؟

"میں نے آٹھ سال گزارے ہیں آسٹریلیا میں..." سقراط نے اپنے چہرے پر کوئی تاثر ابھرنے نہیں دیا۔ اس کی نظریں سیدھی دیوار پر جمی تھیں۔ "وہاں میں فارغ بیٹھ کر دن نہیں گزار رہا تھا۔ دن رات محنت کی ہے، کمایا ہے میں نے...اور یہ پیسہ میری اپنی حلال کی کمائی کا ہے۔"

وہ سپاٹ لہجے میں کہہ کر، سرمد صاحب کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہاں سے ہٹ گیا اور راہداری کے موڑ پر غائب ہو گیا۔ سرمد صاحب کچھ سخت سست کہنا چاہتے تھے مگر سلال نے انہیں روک دیا۔

"ہم ان کی یہ رقم لوٹا دیں گے...مگر ابھی کوئی تماشہ نہیں پلیز..." سلال کی بات پر وہ پہلو بدل کر رہ گئے۔ وہ وہیں پتھر بنے بیٹھے رہے جبکہ سلال اپنے تڑپتے ہوئے دل کو سنبھالتا ہوا زہرہ بیگم کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ کمرے کے اندر مدھم نیلی لائٹ جل رہی تھی اور مشینوں

کے سگنل گونج رہے تھے۔زہرہ بیگم اس وقت تیز ادویات اور مسکن کے اثر کے باعث گہری نیند سو رہی تھیں۔ان کے چہرے کی سرخی اب ایک زرد، بے جان سفیدی میں بدل چکی تھی اور ان کے دونوں ہاتھوں پر لگی ڈرپس ان کی بے بسی کا اشتہار تھیں۔سلال دھیرے سے دروازہ بند کر کے ان کے سرہانے آ کھڑا ہوا۔وہ ایک مرد تھا، ایک پروقار بھائی اور ایک مضبوط بیٹا جو پچھلے دو دن سے اپنے خاندانی ملبے کو اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے تھا۔وہ سب کے سامنے رو نہیں سکتا تھا، وہ اپنی بہن اور باپ کے سامنے کمزور نہیں پڑ سکتا تھا مگر اس وقت اپنی ماں کے اس بے جان وجود کو دیکھ کر اس کا وہ ضبط ریت کی دیوار کی طرح ڈھیر ہو گیا۔اس کی حالت کسی زار و قطار روتے ہوئے انسان سے بھی بدتر تھی۔اس نے دھیرے سے آگے بڑھ کر زہرہ بیگم کے نیلے پڑتے ہوئے، کمزور ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا اور اسے اپنے ماتھے سے لگا لیا۔اسے بچپن کے وہ دن یاد آئے جب وہ ذرا سا بیمار ہوتا تھا تو زہرہ بیگم پوری پوری رات اس کے سرہانے بیٹھ کر گزار دیتی تھیں۔ ان کے ہاتھوں کا وہ گرم لمس، ان کی وہ دعا کرتی ہوئی آواز جو ہمیشہ سلال کے گرد ایک حصار بناتی تھی...آج وہ خود اس حصار سے محروم، لائف سپورٹ کے رحم و کرم پر لیٹی تھیں۔

"امی...پلیز جلدی ٹھیک ہو جائیں۔" سلال نے ان کے ہاتھ کو اپنی نم آنکھوں سے لگایا۔حلق سے ایک دبی ہوئی سسکی نکلی جو باہر نہ آ سکی۔اس کی آنکھیں سرخ انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں اور ان میں نمی تیر رہی تھی۔

"پلیز امی...آپ کی بہت ضرورت ہے ہمیں...پلیز جلدی ٹھیک ہو جائیں۔" وہ گھٹی گھٹی آواز میں کہہ رہا تھا۔کبھی انکا ہاتھ آنکھوں سے لگاتا اور کبھی ان کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر ان کی پیشانی چومتا...سلال شبگیر کی جان جیسے بستر پہ پڑیں زہرہ بیگم میں آ بسی تھی۔ وہ ٹھیک سے سانس بھی نہیں لے پا رہا تھا۔ایک مرد کا رونے سے انکار اس کے اندر کے طوفان کو کتنا مہیب بنا دیتا ہے یہ اس وقت سلال کے چہرے سے عیاں تھا۔وہ
اپنی ماں کے ہاتھوں پر لگی مہندی کے ہلکے رنگ کو دیکھ رہا تھا جو نیمل کی شادی کی خوشی میں انہوں نے بھی لگائی تھی۔وہ خوشی اب ایک ایسے بھیانک خواب میں بدل چکی تھی جس کی صبح کسی کو معلوم نہیں تھی۔

☆...☆...☆

ہسپتال کی سفید راہداریوں سے دور، شبگیر ہاؤس کے در و دیوار پر اس وقت ایک دم گھٹانے والی اداسی کا راج تھا۔ صحن میں لگی لائٹس اب بھی دھیمی جل رہی تھیں، جیسے اس بربادی پر نوحہ کناں ہوں۔ گھر کا ہر فرد اندر سے بکھر چکا تھا مگر المیہ یہ تھا کہ اس کٹھن گھڑی میں ہر کوئی اپنے اپنے آنسو دوسرے سے چھپاتے پھر رہا تھا۔ کوئی نہیں چاہتا تھا کہ اس کی کمزوری دوسرے کے گرتے ہوئے حوصلے کو آخری دھکا دے دے۔ کچن میں گھٹن اور حبس کا عالم تھا۔ نامرہ چولہے کے سامنے کھڑی دادی کے لیے ہلکی چائے اور تیز بخار میں پھنکتی تارہ کے لیے سوپ ابالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے اپنے اعصاب جواب دے چکے تھے مگر وہ زبردستی اپنے پیروں کو جمائے کھڑی تھی۔ بھاپ اڑاتی پتیلی کے پاس کام کرتے ہوئے، اس کے مہندی لگے ہاتھ بار بار تپش سے جل رہے تھے۔ وہ حنائی رنگ آج اس کی پوروں پر کسی گرم کوئلے کی طرح چبھ رہا تھا۔ بے دھیانی میں جیسے ہی گرم پتیلی کا کنارہ اس کی انگلی سے چھوا، ایک تیز جلن اس کے وجود میں دوڑ گئی۔ اس نے تڑپ کر اپنا ہاتھ پیچھے کیا مگر اس کے لبوں سے کوئی آواز نہیں نکلی۔ یہاں کچن میں ہر جگہ زہرہ بیگم کی خوشبو تھی۔ نامرہ بے آواز رو دی مگر کچن میں کوئی آ نہ جائے اس لیے، اس نے جلدی سے اپنے بہتے ہوئے آنسوؤں کو دوپٹے کے پلو سے رگڑا اور گیس کی آنچ دھیمی کر دی۔ وہ اپنے اندر کے طوفان کو پی رہی تھی تاکہ باہر کسی کو اس کی سسکیاں سنائی نہ دیں۔

اندر ماحول مزید دل خراش تھا۔ تارہ بستر پر نقاہت زدہ پڑی تھی۔ اس کا چہرہ تپش کی وجہ سے سرخ ہو رہا تھا اور وہ ہذیانی کیفیت میں بار بار کروٹیں بدل رہی تھی۔ اس کے سرہانے دادی بیٹھی تھیں، جن کا اپنا بلڈ پریشر خطرناک حد تک ہائی تھا۔ ان کے اپنے ہاتھ صدمے اور نقاہت سے بری طرح کانپ رہے تھے مگر وہ اپنی تکلیف کو بھول کر تارہ کو سہلانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ڈاکٹر نے اسکا معائنہ کر لیا تھا۔ دوا بھی دے دی تھی مگر اسکا بخار تھوڑی دیر کے لیے اترتا اور پھر چڑھ جاتا۔ جب بھی تارہ نیند میں سسکتی، دادی کا دل سینے میں دھک سے رہ جاتا۔ ان کی آنکھوں کے گوشوں سے آنسو نکل کر ان کے چہرے کی جھریوں میں جذب ہو رہے تھے لیکن جیسے ہی باہر سے نامرہ یا نوفہ کے قدموں کی آواز آتی، وہ جلدی سے اپنی چادر سے منہ چھپا لیتیں تاکہ بچیاں انہیں روتا ہوا نہ دیکھ لیں۔ ان سب سے الگ، اپنے تاریک کمرے کے ایک کونے میں نیمل جائے نماز پر بیٹھی تھی۔ سیاہ دوپٹے کا حصار اس کے گرد لپٹا تھا اور اس کے دونوں ہاتھ دعا کے لیے فضا میں اٹھے ہوئے تھے۔ وہ سسک رہی تھی... اس کا پورا وجود اس خاموش روئداد میں بری طرح کانپ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے گرنے والے گرم آنسو اس کے ہاتھوں پر لگی اسی داغ مہندی پر گر رہے تھے جسے وہ کھرچ چکی تھی لیکن اس کا رنگ اب بھی باقی تھا۔

"یا باری تعالیٰ... میں نے ایسا تو کبھی نہیں سوچا تھا۔" نیمل کے خشک لبوں سے ایک دھیمی فریاد نکلی۔ "میری ماں کو زندگی دے دے... یا اللہ! میرے خاندان کا بھرم رکھ لے۔ میں اس امتحان کے قابل نہیں ہوں، مجھ پر رحم فرما!"

اس نے زندگی میں ہمیشہ اصولوں اور سچائی کا ساتھ دیا تھا مگر قانون کی کتابوں میں کہیں یہ نہیں لکھا تھا کہ ایک سچ کی اتنی بڑی قیمت چکانی

پڑے گی کہ اس کا پورا خاندان ہی اس کی لہروں میں بہہ جائے گا۔ وہ بار بار اپنا سر سجدے میں گرا دیتی۔ اب تو آنسوں بھی جیسے سوکھنے لگے تھے۔ زندگی یوں پلٹ جائے گی، چند لمحوں میں ہنستا کھیلتا گھر ہسپتال کے آئی سی یو کے باہر پناہ ڈھونڈے گا... یہ اس گھر کے کسی فرد نے خواب وخیال میں بھی نہیں سوچا تھا۔ رات کا سیاہ سایہ شبگیر ہاؤس پر گہرا ہوتا جا رہا تھا۔

☆...☆...☆

ہسپتال کے کارڈیک وارڈ میں رات کی شفٹ شروع ہو چکی تھی اور راہداری کی روشنیاں تیز کر دی گئی تھیں۔ سرمد صاحب کو فیکٹری کے کچھ انتہائی ناگزیر قانونی اور مالی معاملات کے لیے جانا پڑا تھا۔ سلال تھوڑی دیر پہلے ہی شبگیر ہاؤس روانہ ہوا تھا تاکہ تارہ کا بخار دیکھ سکے اور نیمل کو واپس ہسپتال لا سکے۔ اب آئی سی یو کے باہر اس ویران سفید راہداری میں صرف ایک ہی شخص موجود تھا... سقراط شبگیر۔
عین اسی وقت، ہسپتال کے دوسرے بلاک سے اپنی ڈیوٹی ختم کر کے، نجف اپنے وارڈ سے سیدھی ادھر چلی آئی۔ اس کے چہرے پر تھکن کے گہرے سائے تھے مگر اس کی نظریں سیدھی آئی سی یو کے شیشے پر جمی تھیں جہاں سینئر کارڈیالوجسٹس کی ٹیم زہرہ بیگم کا معائنہ کر رہی تھی۔ نجف نے اندر جا کر ڈاکٹرز سے بریفنگ لی، رپورٹس کا ازسرِ نو جائزہ لیا اور جب وہ چند منٹوں بعد دروازہ سرکا کر باہر نکلی تو سقراط جو بے چینی سے چکر کاٹ رہا تھا، فوراً تیز قدموں سے اس کی طرف بڑھا مگر نجف کو سامنے دیکھ کر سقراط کے قدم یکلخت ٹھٹک گئے۔ اس کا وجود نجف سے چند قدم کے فاصلے پر منجمد ہو گیا۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر ساری انا، ساری کدورت ایک جانب رکھتے اس کی طرف بڑھا۔

" کیسی ہے اب ان کی طبیعت؟" سقراط نے اپنے دل پر جیسے کوئی بھاری پتھر رکھتے ہوئے پوچھا۔ نجف نے سر اٹھا کر سقراط کی سرکش آنکھوں میں دیکھا۔ پچھلے چند دنوں سے وہ بھی اسی ہسپتال کی چھت تلے جاگ رہی تھی اس کی اپنی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"ٹھیک نہیں ہیں۔"

وہ بس اتنا ہی کہہ پائی۔ اس کی آواز میں ایک ڈاکٹر کی بے بسی جھلک رہی تھی، جس کے بعد کسی مزید وضاحت کی گنجائش نہیں بچتی۔

بظاہر وہ دونوں ایک دوسرے سے شدید نفرت کرتے تھے مگر زہرہ بیگم کی ڈوبتی ہوئی سانسوں نے آج انہیں ایک بار پھر ہسپتال کی اس سرد چھت تلے بالکل آمنے سامنے لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ سقراط نے نجف کے اس مختصر جواب پر کوئی دوسرا سوال نہیں کیا۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا اور چند قدم پیچھے ہٹ کر کھڑکی کے قریب ستون سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ نجف سے زاویہ بدل چکا تھا اور وہ وہاں کھلی کھڑکی سے باہر پھیلی رات کی تاریکی کو دیکھ رہا تھا جہاں سرد ہوا کے جھونکے اس کے بالوں کو چھو کر گزر رہے تھے۔

جبکہ نجف...وہ وہیں پاس رکھے صوفے پر بیٹھ گئی۔اس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے کوٹ کی جیبوں میں ڈال لیے اور اپنا سر پیچھے دیوار سے ٹکا دیا۔اب ان دونوں کے درمیان طویل خاموشی کا راج تھا مگر یہ کوئی عام خاموشی نہیں تھی۔یہ خاموشی بول رہی تھی۔اس سرد ماحول اور تنہائی نے وقت کا پہیہ یکلخت پیچھے گھما دیا۔کھڑکی سے آتی ٹھنڈی ہوا اور صوفے کی سردی نے ان دونوں کی آنکھوں کے سامنے دس سال پہلے کے مناظر لا کھڑے کیے۔یہ وہ وقت تھا جب وہ دونوں اس دنیا کے لیے سقراط اور نجف نہیں تھے بلکہ SAJAF تھے۔میڈ فار ایچ ادر تھے۔

وہ ایک ایسا دور تھا جب سقراط کے نام پر نجف سب کچھ وارنے کو تیار رہتی تھی اور نجف کی ایک سسکی پر سقراط پوری دنیا سے لڑ جاتا تھا مگر پھر... پھر ماضی کا وہ بھیانک طوفان آیا۔آج دس سال بعد وہ دونوں اسی شدت کے ساتھ ایک دوسرے کے قریب تھے،مگر ان کے بیچ دس سال کے فاصلے،جیل کی سلاخیں اور خاندانوں کی نفرت ایک ناقابلِ عبور دیوار بن کر کھڑی تھی۔وقت کے پنے تیزی سے پھڑ پھڑائے اور ہواؤں نے ماضی کی کتاب کو ایک پھر بار سے کھول دیا۔

رات کے بارہ بجے ٹیبل لیمپ کی مدہم زرد روشنی میں نجف اپنی موٹی میڈیکل کی کتابوں کے سامنے سر پکڑے بیٹھی تھی،اس کے چہرے پر امتحانات کا شدید تناؤ تھا۔

"بہت مشکل ہے سقراط!مُجھے لگتا ہے میں ایک اچھی سرجن نہیں بن پاؤں گی۔"وہ ہارے ہوئے لہجے میں فون پہ کہہ رہی تھی۔

"تم اس شہر کی سب سے بہترین سرجن بنو گی کیونکہ تمہارے ہاتھوں میں شفا خدا نے لکھی ہے اور تمہاری پشت پر سقراط شبگیر کا یقین کھڑا ہے۔ مُجھے یقین ہے تم ایک دن بہترین ڈاکٹر کہلاؤ گی۔"

وقت کے پنے پھر دھیرے سے پھڑ پھڑائے۔منظر بدل گیا۔

"نشاط نے بتایا تمہیں پریکٹس کے دوران چوٹ لگی ہے؟"وہ پشیمان سی فون کان سے لگائے پوچھ رہی تھی۔

"اتنی معمولی سی چوٹیں تو لگتی رہتی ہیں۔کوئی بڑی بات نہیں ہے۔تم بتاؤ پریکٹیکل کیسا رہا؟"

"بہت اچھا...میں بہت خوش ہوں۔"وہ مسکرا رہی تھی۔اچانک ایک نرس ٹرالی گھسیٹتے ہوئے ان کے قریب سے گزرا اور ماضی کا وہ سنہری

طلسماتی سحر کسی کاغذی محل کی طرح ایک ہی لمحے میں چور چور ہو گیا۔ کھلی کھڑکی سے داخل ہوتی یخ بستہ ہوا جب سقراط کے بالوں کو چھو کر گزر رہی تھی۔ نجف جیسے ہوش میں آ چکی تھی۔ اس کے چہرے سے نرمی یکسر غائب ہو چکی تھی اور اس کی جگہ ایک مخصوص سختی لوٹ آئی تھی۔ اس نے ذرا سا رخ موڑ کر سقراط کو دیکھا اور اس کے لبوں سے تلخی کا پہلا تیر نکلا۔

"تمہیں وہاں نہیں ہونا چاہیے تھا، سقراط!"

سقراط نے اپنا رخ نہیں موڑا مگر اس کے شانوں کی سختی بتا رہی تھی کہ تیر نشانے پر لگا تھا۔ وہ کچھ نہیں بولا۔ جبڑے مزید بھنچ گئے۔

"تمہیں نیمل کی شادی میں نہیں جانا چاہیے تھا۔" نجف کی آواز میں پچھلے دو دنوں کی تھکن کے ساتھ ساتھ ایک زہریلی کاٹ شامل ہو چکی تھی۔ "جب تم اچھی طرح جانتے تھے کہ تمہارا ماضی کیا ہے، جب تم جانتے تھے کہ لوگ اور نیمل کے سسرال والے تمہیں کس نظر سے دیکھیں گے...تو تم وہاں اپنی انا کا مظاہرہ کرنے کیوں گئے؟"

یہ جملہ سنتے ہی سقراط کے اندر جیسے کسی نے جلتا ہوا تیزاب انڈیل دیا ہو۔ اذیت، غصے اور تذلیل کی ایک لہر اس کے رگ و پے میں پھیل گئی۔ وہ ایک جھٹکے سے ستون سے الگ ہوا اور تیز قدم اٹھاتا ہوا سیدھا نجف کے بالکل سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس کا قد اتنا لمبا اور وجود اتنا قوی تھا کہ اس کا سایہ صوفے پر بیٹھی نجف پر چھا گیا۔

"کیا ہے میرا ماضی؟ بتاؤ کیا ہے میرا ماضی؟"

سقراط کی آواز میں ایک دبی دبی گرج تھی، اس کی آنکھیں خون کی طرح سرخ ہو رہی تھیں اور ان سے نکلتی ہوئی غضب ناک آگ نجف کو اپنے وجود کے آر پار ہوتی محسوس ہوئی۔ نجف چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر جھٹکے سے صوفے سے اٹھی اور اپنے سینے پر دونوں بازو کس کر باندھتے ہوئے، سقراط کی ان تپتی ہوئی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑی ہو گئی۔

"وہی جو یہ پوری دنیا جانتی ہے، سقراط شبگیر!" نجف نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "وہی بدنامی کا طوق جس کی وجہ سے آج میری آپا اس آئی سی یو میں زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہی ہیں، اور جس کی وجہ سے نیمل کی زندگی کا سب سے بڑا دن بھیانک خواب میں بدل گیا۔"

نجف نے جیسے سقراط کے زہریلے زخموں پر نمک چھڑک گیا۔ سقراط نے اپنی مٹھیاں اس حد تک بھینچ لیں کہ اس کے ناخن اس کی اپنی ہی ہتھیلیوں میں پیوست ہو گئے۔ اس کی تکلیف اور اذیت میں بے پناہ اضافہ ہو چکا تھا، وہ نجف کو ایسی جلتی ہوئی، زہریلی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے اسے ابھی راکھ کر دے گا۔ چند لمحے یونہی دیکھتا رہا اور پھر... بے ساختہ ہنس دیا۔ ایک خشک، کھوکھلی اور تمسخرانہ ہنسی!

"محترمہ نجف بزدار صاحبہ!" سقراط نے اپنے ہاتھ پتلون کی جیبوں میں ڈالے اور حد درجہ حقارت سے جھک کر اس کے چہرے کو دیکھا، "میرا ماضی آپ کے اس خاندانی غرور، آپ کی بہن کی سازشوں اور آپ کی اپنی منافقت کی دین ہے! مُجھے میرا ماضی یاد دلانے کی غلطی مت کرو ورنہ میں بھول جاؤں گا کہ میں اس وقت ہسپتال کی حد میں کھڑا ہوں اور تم نے دس سال پہلے میرے ساتھ کیا کیا تھا۔"

نجف کے چہرے پر بھی پل بھر کے لیے ایک شدید، نا قابلِ برداشت اذیت ابھری۔
محبت جب اپنا راستہ بدلتی ہے، تو وہ سیدھی نفرت کی گہری کھائی میں جا گرتی ہے۔ وہ دونوں کبھی ایک دوسرے کے ساتھ پوری زندگی گزارنا چاہتے تھے مگر آج وہ دونوں ایک دوسرے سے اس شدت سے نفرت کرتے تھے کہ ان کا ایک دوسرے کے قریب کھڑا ہونا بھی فضا میں بارود بھر دیتا تھا۔

"میں نے جو کچھ کیا، وہ اپنی سچائی اور اصولوں کے لیے کیا تھا!" نجف نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا اس کے گلے میں آنسوؤں کا گولہ سا اٹک رہا تھا مگر اس نے اسے باہر نہیں آنے دیا۔ "لیکن تم.. تم آج بھی اسی تکبر میں جی رہے ہو۔ تم نے نیمل کی خوشیوں کی قربانی دے دی صرف اس لیے کہ تم..."

"وہ میری بھتیجی ہے، وہ میری بیٹی ہے۔ میرا حق بنتا ہے اسکے ساتھ کھڑے ہونا۔"

نجف کے چہرے پر تمسخرانہ ہنسی ابھری۔

"تو اب تم اپنی بھتیجی کا گھر اجاڑ کر خوش ہو؟ مالا پہناؤں تمہیں اس اعزاز کے لیے؟"

اسکے الفاظ جلتی پر تیل کا کام کر رہے تھے۔ سقراط کئی لمحے بے یقینی سے اسے دیکھا گیا۔

"اور اگر تم اتنے ہی پاک باز تھے تو تم نے اپنا گناہ کیوں قبول کیا تھا؟" نجف کی آنکھوں میں نفرت کے ساتھ ساتھ اذیت کی نمی ابھری۔اس آدمی کی وجہ سے اس نے پچھلے دس سال اذیت اٹھائی تھی۔اسے ایک ایک لمحہ ایک ایک پل یاد تھا۔

" کیوں تم اپنی بے گناہی ثابت نہ کر سکے؟"

سقراط نے اسکی جلتی ہوئی آنکھوں کو دیکھا۔غضب یہ تھا وہ اسکے سامنے کھڑا تھا اور ابھی بھی اس کی آنکھوں میں سقراط کا عکس تھا۔

" کیونکہ قانون اندھا ہوتا ہے... بالکل تمہاری ان آنکھوں کی طرح!"

نجف کا چہرہ فق ہو گیا۔سقراط نے اپنا دائیاں ہاتھ اٹھا کر نجف کے چہرے کے بالکل قریب کیا۔اس کی انگلی کانپ رہی تھی۔

"داغ میری ذات پر کبھی تھا ہی نہیں، داغ تمہاری ان آنکھوں اور تمہارے اس دل پر تھا جو سچ دیکھ کر بھی اندھا ہو گیا۔آج اگر زہرہ بھابھی آئی سی یو میں اس حال میں لیٹی ہیں، تو اس کی پہلی ذمہ دار تم، تمہاری بہن اور تمہارا باپ ہے اور یاد رکھنا ڈاکٹر صاحبہ...اگر اس آئی سی یو کا دروازہ کھلا اور اندر سے کوئی بری خبر آئی تو میں تمہیں ایسی سزا دوں گا کہ تمہاری روح تک کانپ جائے گی۔"

یہ سنگین دھمکی نجف کے منہ پر مارنے کے بعد، سقراط نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا۔اس نے اپنا بکھرتا ہوا وجود سمیٹا اور تیز قدموں کے ساتھ راہداری کے تاریک حصے کی طرف بڑھ گیا۔اس کے جانے کے بعد بھی اس کے سنگین قدموں کی چاپ راہداری میں گونجتی رہی۔نجف وہیں کھڑی رہ گئی، اس کے سینے پر بندھے بازو ڈھیلے پڑ گئے، اس کا پورا وجود شدید کپکپاہٹ کی زد میں تھا۔اسکی آنکھوں میں نمی لہرا رہی تھی جہاں ماضی اور حال کا زہر ایک ساتھ بہہ رہا تھا۔

☆...☆...☆

بزدار اسپورٹس کالج کا وسیع و عریض گراؤنڈ شام کی فلڈ لائٹس کی تیز زرد روشنی میں نہایا ہوا تھا۔ثالث بزدار ہاتھ میں اپنی ہاکی اسٹک تھامے، ڈریبلنگ کرتا ہوا بال کو گول پوسٹ کی طرف لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ویسے تو اس کی ہر موو میں بلا کی چابکدستی ہوتی تھی مگر آج اس کی ہاکی فیلڈ پر بغیر کسی سمت کے چل رہی تھی۔

اس کا ذہن یہاں گراؤنڈ میں تھا ہی نہیں۔ پچھلے دو دنوں سے ٹی وی اسکرینز اور اخبارات میں شبگیر خاندان کے گرد گھومتی گندی خبریں، زوریز کی گرفتاری اور اب زہرہ بیگم کی انتہائی تشویشناک حالت کی اطلاع اس کے دماغ میں چابک کی طرح برس رہی تھی۔ اس نے پچھلے چوبیس گھنٹوں میں نامرہ کے نمبر پر درجنوں میسجز اور کالز کی تھیں مگر دوسری طرف سے صرف ایک ہولناک خاموشی کا سامنا تھا۔ کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ نامرہ کے اس خاموشی نے اس کے اندر ایک عجیب سی بے چینی، الجھن اور گھبراہٹ بھر دی تھی۔ جانے کیوں بار بار اسکا خیال آ رہا تھا۔ وہ جن حالات سے گزر رہی تھی ثالث کو وہ سوچتے ہوئے بھی برا لگ رہا تھا۔

تنگ آ کر اس نے ہاکی اسٹک زمین پر پھینکی، بینچ سے اپنا تولیہ اور فون اٹھاتے ہوئے فیلڈ سے باہر نکل آیا۔ اس نے اپنے دوسرے غیر معروف نمبر سے نامرہ کا نمبر ڈائل کیا۔ برقی لہروں نے فاصلہ طے کیا اور شبگیر ہاؤس کے خاموش لاؤنج میں میز پر رکھے نامرہ کے فون پر ایک انجان نمبر سے دستک دی۔ لاؤنج میں اس وقت شدید گھٹن تھی۔ تارہ کو بخار کی دواء کے بعد، نامرہ اب دادی کو ان کے بلڈ پریشر کی ادویات دے رہی تھی۔ فون کی مسلسل وائبریشن پر اس نے چونک کر دیکھا۔ سکرین پر ایک نامعلوم نمبر چمک رہا تھا۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ شاید ہسپتال سے فون ہو۔ یہی سوچتے ہوئے کال ریسیو کر کے فون کان سے لگا لیا۔

"ہیلو...؟" اس کی آواز میں تھکن اور بے بسی گھلی ہوئی تھی۔

"میں ثالث بات کر رہا ہوں۔" ثالث نے دوسری طرف سے بنا کسی تمہید کے، فوراً کہا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں نامرہ آواز سنتے ہی فون کاٹ نہ دے۔ نامرہ کی فوراً تیوری چڑھی، اس کی آنکھوں میں غصے اور دکھ کی ایک ساتھ لہر دوڑی۔

"جی بولیں۔"

"ایم...سوری، اگر تمہیں میرا اس طرح فون کرنا برا لگا ہو۔" ثالث نے اپنی سپورٹس کٹ کی زیپ بند کرتے ہوئے، وہ شدید ہچکچاہٹ اور الجھن کا شکار تھا۔ اس کے الفاظ اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے، وہ جو گراؤنڈ میں اپنے حریفوں کو چٹنی دے دیتا تھا، اس وقت ایک لڑکی کی خاموشی کے سامنے بالکل بے بس نظر آ رہا تھا۔ "مُجھے مجھے بس جاننا تھا...تم...تم ٹھیک ہو؟"

ثالث کے اس سادے سے سوال کے پیچھے اس کی وہ تمام بے چینی چھپی تھی جو وہ پچھلے دنوں سے سینے میں دبائے گھوم رہا تھا۔ وہ اب پارکنگ کی جانب بڑھ رہا تھا۔

"تم لوگوں کے ہوتے ہوئے سب ٹھیک کیسے ہوسکتا ہے؟"

نامرہ کا ضبط ایک ہی لمحے میں جواب دے گیا۔وہ باہر صحن کی تاریکی میں نکل آئی تھی جہاں اس کا ضبط پھٹ پڑا۔ثالث گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے وہیں ساکت ہوگیا۔اس کا ہاتھ ہینڈل پر ہی جم گیا۔

"ایم سوری نامرہ،لیکن..."

"تم لوگوں کی وجہ سے میرے چاچو کی زندگی تباہ ہوئی!"نامرہ نے تقریباً چیختے ہوئے کہا،اس کے پورے وجود میں ایک کپکپاہٹ دوڑ گئی۔
"دس سال پہلے تمہارے خاندان نے ان کا مستقبل برباد کیا،انہیں جیل بھیجا،اوراب..."

ایک گرم،تکلیف دہ آنسوؤں کا گولا نامرہ کے گلے میں آکر بری طرح اٹک گیا۔اس کی سانس پھولنے لگی۔سب سے آسان انتقام کسی بے قصور کو قصوروار ثابت کرنا ہے۔
انسان کو کبھی کبھی blame کرنے کے لیے کوئی دوسرا انسان چاہیے ہوتا ہے تاکہ وہ اپنے اندر کا غبار نکال سکے۔

"نامرہ..."

ثالث نے اپنی زندگی میں پہلی بار اس کا نام اتنے دھیمے اور التجا بھرے لہجے میں پکارا تھا۔مگر اسے نامرہ کی سسکی سنائی دی۔وہ خاموش ہوگیا۔وہ اسے بولنے دینا چاہتا تھا۔

"تم لوگ پتھر ہو...تم...تمہارا دادا جی،تمہاری پھوپھو،تم تم سب انسان نہیں ہو!تم سب کے اندر دل کی جگہ پتھر لگے ہوئے ہیں۔"

ثالث اب گاڑی کی سیٹ پر بیٹھا،فون کان سے لگائے بالکل ساکت وجامد یہ تمام الزامات سنتا رہا۔اس کے پاس صفائی میں کہنے کے لیے کوئی ایک لفظ بھی نہیں تھا۔حیرت کی بات یہ تھی اسے برا نہیں لگ رہا تھا۔

"ہم نے کیا بگاڑا تھا تمہارا؟" نامرہ کی آواز اب بالکل دھیمی ہو چکی تھی، " کیوں نہیں جینے دیتے تم لوگ ہمیں؟ کیوں ہر بار ہمارے گھر کی خوشیوں کو ماتم میں بدل دیتے ہو؟ پلیز دور رہو ہم سے..."

فون کٹ گیا۔ ثالث نے گہرا سانس لیا، کہیں نہ کہیں یہ حقیقت تھی۔ دس سالہ پرانا ماضی ہمیشہ شبگیر خاندان کے سامنے آ کھڑا ہوتا تھا۔ بزداروں کا کیا بگڑا تھا؟ جس لڑکی سے شبگیر خاندان کے لڑکے نے زیادتی کی کوشش کی وہ آج ٹی وی کی معروف ہستی تھی۔ شادی شدہ تھی لیکن سقراط؟ وہ آج بھی ریپسٹ کہلاتا تھا۔

☆...☆...☆

آئی سی یو سے ملحقہ پرائیویٹ کمرے میں عجیب سی خاموشی اتری ہوئی تھی۔ سفید دیواروں سے ٹکراتی مانیٹر کی وقفے وقفے سے ابھرتی بیپ ...بیپ... کی آواز ہی اس سکوت کو توڑ رہی تھی۔ کھڑکی کے پردوں سے چھن کر اندر آتی مدھم دھوپ، کمرے کو ایک بے رنگ اداسی میں لپیٹے ہوئے تھیں۔

زہرہ بیگم کو ہوش آئے چند گھنٹے گزر چکے تھے مگر جسم اب بھی ادویات کے زیرِ اثر بالکل نڈھال تھا۔ ان کا چہرہ حد درجہ زرد دکھائی دے رہا تھا، لب خشک تھے اور ہاتھ کی پشت پر لگی ڈرپ کی سوئی کے گرد نیلاہٹ پھیل چکی تھی۔ سانسیں اگرچہ معمول پر آ چکی تھیں لیکن ہر سانس جیسے سینے پر ایک الگ بوجھ رکھ دیتی تھی۔

انہوں نے بڑی مشکل سے پلکیں اٹھائیں۔ ان کے سامنے، سرہانے کے قریب رکھی کرسی پر سرمد شبگیر بیٹھے تھے۔ ان کا سر جھکا ہوا تھا۔ دونوں کہنیاں گھٹنوں پر ٹکی تھیں اور ہاتھ آپس میں اس شدت سے جڑے ہوئے تھے کہ انگلیوں کی پوریں سفید پڑ گئی تھیں۔ زہرہ بیگم نے اپنی زندگی میں انہیں بہت سے روپ میں دیکھا تھا۔ غصے میں...وقار میں...کامیابی میں...اولاد کے لیے ڈھال بنتے ہوئے مگر اس قدر شکستہ؟ شاید کبھی نہیں۔ سرمد صاحب نے آہٹ محسوس کی تو سر اٹھایا۔ ان کی آنکھیں رات بھر جاگنے اور مسلسل رونے سے بری طرح سرخ ہو چکی تھیں۔ داڑھی کے سرمئی بالوں میں آنسو اب بھی نمی چھوڑے ہوئے تھے۔ چند لمحے وہ خاموشی سے زہرہ بیگم کو دیکھتے رہے۔ پھر جیسے برسوں سے بندھا ایک بند ٹوٹ گیا۔ انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے زہرہ بیگم کی ہتھیلی اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ وہ ہتھیلی ہمیشہ گرم رہتی تھی...آج برف کی طرح سرد تھی۔ سرمد صاحب نے اسے آہستگی سے اپنے ماتھے سے لگا لیا۔

"مُجھے معاف کردو، زہرہ...خدا کے لیے...مُجھے معاف کردو۔"

کمرے میں پھر خاموشی چھا گئی۔زہرہ بیگم نے انہیں دیکھا۔ان کی پلکوں پر نمی اتر آئی۔سرمد صاحب نے لرزتے ہوئے سانس لیا۔

"میں ہمیشہ سمجھتا رہا کہ میں تمہاری حفاظت کررہا ہوں..."وہ تلخی سے مسکرائے۔
" مگر آج احساس ہوا...سب سے زیادہ دکھ شاید میں نے ہی تمہیں دیا ہے۔"ان کی نظریں کہیں بہت دور جا ٹکیں۔

"مُجھے یاد ہے، جب تم میرے ساتھ اس گھر میں آئیں تو تمہارے پیچھے پورا میکہ چھوٹ گیا تھا۔"ان کا گلا بھر آیا۔

"تم نے کبھی شکایت نہیں کی...مگر میں نے..."وہ رک گئے۔"میں نے بار بار تمہارے اپنے لوگوں کو تمہارے سامنے برا کہا۔ان کے فیصلوں پر غصہ نکالا۔ان کے غرور کو کوسا۔میں یہ بھول گیا تھا کہ وہ جیسے بھی تھے...تھے تو تمہارے اپنے۔"

اگر بزداروں کا غرور نہیں ٹوٹا تھا تو سرمد شبگیر کونسا جھک گئے تھے؟

"مُجھے تمہارے لیے جھک جانا چاہیے تھا، زہرہ۔صرف ایک بار...صرف تمہارے لیے۔"

ایک آنسو ان کے گال سے ڈھلک کر زہرہ بیگم کے ہاتھ پر جا گرا۔

"آج لگتا ہے...میں نے تمہیں شوہر کا سہارا تو دیا، مگر بیٹی ہونے کا حق واپس نہ دلا سکا۔"

زہرہ بیگم کی آنکھوں سے بھی خاموش آنسو بہہ نکلے۔انہوں نے بڑی مشکل سے اپنی انگلی ہلائی۔سرمد صاحب فوراً چونک کر ان کی طرف جھکے۔زہرہ بیگم نے اپنی کمزور انگلیوں سے ان کے ہاتھ کو ہلکا سا دبایا۔وہ ایک معمولی سا لمس تھا...مگر اس میں اٹھائیس برس کی رفاقت بول رہی تھی۔

"ایسا..."انہوں نے بڑی مشقت سے لفظ ادا کیا۔"مت کہیں۔"

سرمد صاحب خاموشی سے انہیں دیکھتے رہے۔

"آپ...میرے نصیب تھے۔"

زہرہ بیگم نے لب تر کرنے کی ناکام کوشش کی۔

"جو میرا تھا...وہ مُجھے مل گیا۔اور جو نہیں ملا..."

انہوں نے آہستہ سے پلکیں جھکا دیں۔

"اس کا شکوہ میں نے کبھی اللہ سے بھی نہیں کیا۔"

سرمد صاحب کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔زہرہ بیگم نے انہیں پہلی بار اس طرح روتے دیکھا تھا۔

"زہرہ..."ان کی آواز بھرّا گئی۔"میں بہت برا شوہر تھا۔"

زہرہ بیگم نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔

"آپ...میرے بچوں کے بہترین باپ ہیں..."چند لمحے سانس بحال کرنے میں گزرے۔

"اور..."ان کی آنکھوں میں نمی چمکنے لگی۔"میرے لیے بہترین شوہر بھی۔"

سرمد صاحب نے بے اختیار ان کے ہاتھ پر اپنے لب رکھ دیے۔زہرہ بیگم ہلکا سا مسکرائیں۔

"ذرا سا غصہ..." انہوں نے دھیرے سے کہا۔ "آپ کی عادت تھی۔"

"محبت..." وہ رکیں۔ "آپ کی فطرت۔"

سرمد صاحب کا ضبط آخر کار جواب دے گیا۔ انہوں نے اپنا سر زہرہ بیگم کے ہاتھ پر رکھ دیا اور برسوں بعد بچوں کی طرح رو پڑے۔ زہرہ بیگم کی آنکھیں بھیگ گئیں۔
انہوں نے بڑی محبت سے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ کو ان کے سر پر رکھ دیا۔

"سب...ٹھیک ہو جائے گا۔"

سرمد صاحب نے سر اٹھایا۔ ان کی آنکھوں میں اب بھی نمی تھی۔

"میں اللہ سے صرف ایک دعا مانگ رہا ہوں، زہرہ۔ تم ٹھیک ہو جاؤ... باقی زندگی میں تمہیں کبھی کوئی شکوہ نہیں ہونے دوں گا۔"

زہرہ بیگم نے انہیں دیکھا۔ پھر وہی پرانی، مانوس، مطمئن سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر آ گئی۔

"مُجھے آپ سے کبھی شکوہ تھا ہی نہیں۔"

کمرے میں پھر خاموشی اتر آئی۔ مگر اس خاموشی میں برسوں کی انا ٹوٹ چکی تھی اور اٹھائیس سالہ رفاقت ایک بار پھر محبت کے آگے سر جھکا چکی تھی۔

☆...☆...☆

سرمد صاحب کے باہر نکلتے ہی کمرے میں چند لمحوں کے لیے پھر خاموشی اتر آئی۔
شیشے کا دروازہ آہستگی سے کھلا۔ اس بار دادی اندر داخل ہوئیں۔ ان کے ساتھ سلال، نامرہ، نوفہ اور نین تارہ بھی تھے۔ ہسپتال کی سفید روشنی

میں دادی کا جھکا ہوا وجود پہلے سے کہیں زیادہ بوڑھا دکھائی دے رہا تھا۔ ہاتھ میں تسبیح تھی مگر انگلیاں مسلسل کانپ رہی تھیں۔ سلال نے سہارا دے کر انہیں زہرہ بیگم کے قریب رکھی کرسی پر بٹھایا۔ جیسے ہی دادی کی نظر آکسیجن ماسک میں ڈھکے زرد چہرے پر پڑی، ان کا ضبط ٹوٹ گیا۔ انہوں نے لرزتے ہاتھ سے زہرہ کے ماتھے کو چھوا۔

"میری بچی..."

بس اتنا ہی کہہ سکیں۔ آواز رندھ گئی۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"تم نے اس گھر کی خدمت میں اپنی جوانی گزار دی...اور میں...میں ہمیشہ تمہارے سامنے تمہارے میکے کو کوستی رہی۔"

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ نوفہ اور تارہ نے ایک دوسرے کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ پائنتی پہ بیٹھی نامرہ کی پلکیں جھک گئیں۔ وہ نم تھیں۔ دادی کی ہچکیاں بندھ چکی تھیں۔

"میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ایک دن تمہیں اس حال میں دیکھنا پڑے گا۔ اگر میرے کسی لفظ نے تمہارا دل دکھایا ہو تو...اپنی اس بوڑھی ساس کو معاف کر دے، زہرہ۔"

زہرہ بیگم کی آنکھوں سے خاموش آنسو بہہ نکلے۔ انہوں نے بڑی مشکل سے اپنا ہاتھ اٹھایا اور دادی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"ایسا نہ کہیں...اماں...آپ نے ہمیشہ مُجھے بیٹی سمجھا ہے۔"

دادی فوراً نفی میں سر ہلانے لگیں۔

"نہیں...بیٹی ہوتی تو شاید اتنے طعنے نہ دیتی۔" وہ رو پڑیں۔ "تم بہو بن کر بھی بیٹی سے بڑھ کر نکلیں۔"

زہرہ بیگم کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ انہوں نے دادی کی انگلیاں تھام لیں۔

"اگر دوبارہ زندگی ملی...تو میں پھر اسی گھر کی بہو بننا چاہوں گی۔"

یہ سنتے ہی دادی بے اختیار جھک کر ان کے ماتھے کو چوم بیٹھیں۔کمرے میں موجود ہر آنکھ نم ہو چکی تھی۔کئی لمحوں تک کوئی کچھ نہ بول سکا۔پھر نین تارہ اچانک آگے بڑھی۔وہ سیدھی اپنی ماں سے لپٹ گئی۔

"امی...آپ گھر کب آئیں گی؟"

اس کی آواز میں وہ خوف تھا جو صرف ایک بچے کے دل میں ہوتا ہے۔زہرہ بیگم نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

"جلدی...بہت جلد۔"

نوفہ بھی جھک کر ان کے گلے لگ گئی۔

"آپ کے بغیر گھر بالکل اچھا نہیں لگتا۔کچن بھی نہیں...صبح بھی نہیں...رات بھی نہیں..."

زہرہ بیگم کی آنکھیں پھر بھر آئیں۔نامرہ خاموشی سے قریب آئی۔اس نے اپنی ماں کے ہاتھ پر بوسہ دیا۔"ہم سب آپ کا انتظار کر رہے ہیں،امی!"

سلال اب تک سب سے پیچھے کھڑا تھا۔اس نے شاید ارادہ کر رکھا تھا کہ نہیں روئے گا۔مگر جب اس کی ماں کی نظر اس پر پڑی تو اس کے اندر کا سارا حوصلہ بکھر گیا۔وہ آہستہ آہستہ آگے آیا۔زہرہ بیگم کے ہاتھ کو دونوں ہاتھوں میں لیا۔پیشانی سے لگایا اور بمشکل اتنا کہہ سکا۔

"امی...جلدی گھر آجائیں۔"

اس کی آواز بھرّا گئی۔

"آپ کے بغیر...وہ گھر گھر نہیں لگتا۔"

زہرہ بیگم نے اپنے کانپتے ہاتھ سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"میرا بہادر بیٹا...اپنی بہنوں کا خیال رکھنا۔"

سلال نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔مگر اس کی آنکھوں سے گرنے والا ایک آنسو زہرہ بیگم کی ہتھیلی پر آ گرا۔اسی لمحے دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی۔نرس اندر آئی۔

"وزٹنگ ٹائم ختم ہو گیا ہے۔"

دادی نے ایک نظر زہرہ بیگم پر ڈالی،ان کا ماتھا چوما،اور بچوں کو ساتھ لے کر آہستہ آہستہ باہر نکل گئیں۔دروازہ بند ہوتے ہی کمرے میں ایک بار پھر خاموشی اتر آئی۔

☆...☆...☆

جب دوبارہ وزٹنگ ٹائم شروع ہوا تو تو کمرے کا بھاری شیشے کا دروازہ دوبارہ ہٹا اور نیمل اندر داخل ہوئی۔اس کی آنکھوں کے گرد جیسے گہرے سیاہ حلقے پڑ چکے تھے اور اس کے ہاتھوں کی مہندی اب بھی اس کی جلد پر داغ کی طرح لگی ہوئی تھی۔وہ قریب آ کر پائنتی پہ بیٹھ گئی۔ زہرہ بیگم اسے دیکھ رہی تھی جبکہ وہ اپنے ناخن کھرچ رہی تھی۔

"کچھ کہو گی نہیں؟" زہرہ بیگم اب قدرے سنبھلی ہوئی تھیں۔اپنے بچّوں سے اپنے خاندان سے مل کر انہیں کافی حوصلہ ہوا تھا۔

"مُجھے معاف کر دیں امی!خدا کے لیے مُجھے معاف کر دیں!یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے..."

نیمل کی آواز میں حد درجہ کرب تھا۔اس کا پورا وجود شدید کپکپاہٹ کی زد میں تھا۔

" کاش میں ان پڑھ رہتی ،امی ! کاش میں کبھی وکیل نہ بنتی ، میں کبھی قانون اور انصاف کے بھاشن نہ دیتی...اگر میں وکیل نہ ہوتی تو میں اس کیس میں نہ پڑتی ،شاہ زیب مُجھے کبھی نہ چھوڑتا ،میری بارات کبھی واپس نہ جاتی ،اور آج...آج آپ اس ہسپتال کے بستر پر اس حال میں نہ لیٹی ہوتیں ! یہ سب میرا قصور ہے ،امی !"

وہ خود کو الزام دے رہی تھی ۔اس نے اپنے علم ،اپنی ڈگری اور اپنے اصولوں کو اپنی ماں کی اس بیماری کے سامنے ایک گناہ کی طرح پیش کر دیا تھا۔زہرہ بیگم نے انتہائی تکلیف سے اپنا دوسرا ہاتھ اٹھایا اور نیمل کے سر پر رکھ دیا۔انہوں نے دھیمی آواز میں نیمل کا سر اٹھایا اور اس کی سوجھی ہوئی آنکھوں میں جھانکا۔

" کبھی اپنے علم اور سچائی کو گناہ مت سمجھنا۔اپنے ضمیر کو کبھی شرمندہ مت ہونے دینا۔شاہ زیب اگر تمہارا نصیب ہوتا تو وہ تمہیں تمہارے اصولوں کے ساتھ قبول کرتا۔جو چلا گیا ، وہ تمہارے قابل ہی نہیں تھا۔"

نیمل نے ان کے ہاتھ پر اپنے لب رکھ دیے ،اس کے آنسو زہرہ بیگم کی جلد کو بھگو رہے تھے۔

"مجھ سے وعدہ کرو نیمل...اگر کل کو مُجھے کچھ ہو گیا ،تو تم اپنے بہن بھائیوں کا خیال رکھو گی۔تم اس گھر کی بڑی بیٹی ہو ،تم سلال کا ہاتھ مضبوط رکھو گی اور ان بچیوں کو کبھی بکھرنے نہیں دو گی۔"

زہرہ بیگم کے یہ الفاظ سنتے ہی نیمل جیسے تڑپ اٹھی۔اس کا دل سینے میں خوف سے دھک سے رہ گیا۔اس نے جھٹکے سے اپنا سر اٹھایا اور خوفزدہ نظروں سے اپنی ماں کو دیکھا۔

"امی ! پلیز خدا کا واسطہ ہے ،ایسی باتیں مت کریں۔" نیمل کی آواز میں ایک خوفناک التجا تھی۔

" آپ کو کچھ نہیں ہو گا۔آپ کو ٹھیک ہونا ہو گا۔ان شائ اللہ آپ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔ہم جلد گھر چلے جائیں گے۔"

"جب تک میری بیٹی میرے ساتھ ہے، مُجھے کچھ ہو بھی کیسے سکتا ہے؟"

نیمل نے زہرہ بیگم کے مسکراتے چہرے کو دیکھا اور اپنی تمام تر تکالیف کے باوجود اس کی آنکھوں میں بھی امید کا ایک چھوٹا سا چراغ روشن ہو گیا۔

☆...☆...☆

ہسپتال کے اس خاموش کمرے کا شیشے کا دروازہ انتہائی ناگواری اور ہچکچاہٹ کے ساتھ کھلا۔ سلال باہر نکلا۔ تمام گھر والے، دادی اور بچیاں.... باری باری زہرہ بیگم سے مل چکے تھے مگر ایک وجود ایسا تھا جو ان کے سامنے جانے سے کترا رہا تھا۔ وہ سقراط تھا جو باہر راہداری کی تاریکی میں، اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھائے ایک مجرم کی طرح دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا رہا تھا۔

"چاچو امی آپ سے ملنا چاہتی ہیں..."

وہ انتہائی سست قدموں سے، سر جھکائے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے بال گردن کے پیچھے ایک چھوٹے جوڑے میں قید تھے۔ اس کا قد کاٹھ جتنا قوی تھا، اس کی روح اس وقت اتنی ہی شکستہ تھی۔ وہ بستر سے چند قدم کے فاصلے پر رک گیا اور پھر ایک کرسی پر سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بالکل سپاٹ اور بے جان تھے...ایک ایسے شخص کا چہرہ جو اپنی ذات کو اندر سے مار چکا ہو زہرہ بیگم کئی طویل لمحوں تک، بغیر کچھ کہے، اپنی نیم وا آنکھوں سے اس سرکش مرد کو دیکھتی رہیں۔
ان کی نظروں کے سامنے ماضی کا زرد چراغ جل اٹھا۔ انہیں سقراط ویسے ہی عزیز تھا جیسے سلال...اٹھائیس سال پہلے، جب زہرہ بیگم شبگیر ہاؤس میں دلہن بن کر آئی تھیں تو سب سے پہلے جس ننھے وجود نے آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ اور انگلی تھامی تھی، وہ سقراط تھا۔ وہ اس گھر کا لاڈلا تھا۔ دادی کا سخت رویہ ہو یا سرمد صاحب کی کڑی ڈانٹ ڈپٹ...زہرہ بیگم ہمیشہ ایک ڈھال بن کر سقراط کو ان کے غصے سے بچاتی تھیں۔ وہ ان کے دل کے اتنا قریب تھا کہ انہوں نے بہن کا ہاتھ سقراط کے ہاتھ میں دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن پھر...پھر نہ جانے کس کا کالا سایہ اس گھر کو نگل گیا۔ نہ جانے کس کی بدنظر ان کے ہنستے بستے آشیانے کو لگ گئی کہ محبت کا وہ تاج ایک ہی رات میں رسوائی کا طوق بن گیا۔ سقراط بالکل ساکت اور خاموش بیٹھا رہا۔ اس کے اندر اتنی ہمت بھی نہیں بچی تھی کہ وہ اپنے خشک لب کھول کر زہرہ بیگم سے اپنے کیے یا نہ کیے کی معافی مانگ سکے۔ وہ بس اندر ہی اندر مر رہا تھا۔ زہرہ بیگم کی جانچتی نگاہیں اس کے جمے ہوئے چہرے کی ایک ایک تحریر پڑھ رہی تھیں۔ انہوں نے انتہائی نقاہت سے اپنا ہاتھ ہلایا۔

"میں تم سے کچھ مانگنا چاہتی ہوں سقراط....کیا تم دو گے؟"

زہرہ بیگم کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ کمرے میں لگی مانیٹر کی بیپ کے ساتھ بمشکل سنائی دی مگر اس سوال کے ساتھ ہی سقراط نے فوراً اپنا سر اٹھایا۔ اس کی بھاری آنکھوں میں التجا اور بے ساختہ دیوانگی کا طوفان ابھرا۔

"آپ جان مانگ لیں، بھابھی!"

زہرہ بیگم کے خشک لبوں پر نقاہت سے بھری مسکراہٹ ابھری۔ وہ اسے نس نس سے پہچانتی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ سقراط سچ کہہ رہا تھا...اگر وہ اس لمحے اس سے اس کا سینہ چاک کر کے دل مانگ لیتیں تو وہ بغیر پلک جھپکائے اپنے ہاتھوں سے اپنا دل نکال کر ان کی ہتھیلی پر رکھ دیتا۔ مگر جو چیز وہ مانگنے جا رہی تھیں۔۔۔وہ شاید اپنی جان دینے سے کہیں زیادہ خوفناک، دردناک اور روح کو شل کر دینے والی اذیت تھی۔

"جان نہیں چاہیے سقراط...لیکن سوچ لو۔" زہرہ بیگم نے گہرا سانس لیتے ہوئے اسے خبردار کیا۔

"آپ پلیز بولیں!" سقراط فوراً کرسی پر سیدھا ہوا، اس کا وجود تناؤ کی زد میں آ گیا۔ "آپ جو کہیں گی، میں وہی کروں گا۔"

کمرے میں کئی طویل لمحوں تک ایک ہولناک خاموشی چھائی رہی۔

"ایسا لگتا ہے سقراط...جیسے وقت بہت کم رہ گیا ہے۔" زہرہ بیگم نے اپنی آنکھیں چھت کی طرف اٹھائیں۔ "ایک انجانے خوفناک خواب نے میرے دل میں اپنے زہریلے پنجے گاڑھ لیے ہیں۔"

سقراط نے بے چینی اور اضطراب سے اپنا پہلو بدلا۔ اس کا دل ڈوبنے لگا مگر اس نے زہرہ بیگم کو اپنی بات مکمل کرنے دی۔

"اگر مُجھے کچھ ہو گیا...تو میرا گھر خالی ہو جائے گا۔" زہرہ بیگم کی آواز یکلخت بھرا گئی۔ ان کا گلا آنسوؤں سے رندھ گیا۔ "میرا گھر بکھر جائے گا...اور میں اپنے اس آشیانے کو یوں ویران نہیں کرنا چاہتی۔ کیا تم...؟ کیا تم...؟"

وہ پریشان نظر آتی تھیں۔سقراط سے یہ مانگتے ہوئے انکا دل انہیں کچوکے لگا رہا تھا۔

" کیا تم...نجف...نجف سے شادی کر سکتے ہو؟"

وہ آگے بھی کچھ کہہ رہی تھیں،ان کے لب حرکت کر رہے تھے،مگر سقراط کا چہرہ ایک ہی سیکنڈ میں کاغذ کی طرح سفید پڑ گیا۔

"میں چاہتی ہوں تم نجف سے شادی کر لو! وہ اس گھر میں آ جائے گی تو...."

سقراط کے جسم کا سارا خون جیسے کسی نے نچوڑ لیا ہو۔اس کے اندر برفانی ہوائیں چلنے لگیں،زلزلے آنے لگے اور ایک ایسا بھیانک جھکڑ اٹھا جس نے اس کی روح کے بچے کچے پرخچے اڑا دیے۔ایسا تو اس نے اپنے بھیانک ترین خوابوں میں بھی نہیں سوچا تھا۔
ایک لمحے کے لیے زہرہ بیگم کے الفاظ غائب ہو گئے اور دس سال پرانے،زہر میں ڈوبے ہوئے الفاظ سقراط کی سماعت سے ٹکرائے۔

" کاش تم مر جاتے،سقراط شبگیر! تم ایک ریپسٹ ہو...تم ایک درندے ہو!"

اسے لگا جیسے وہ ایک بار پھر اسی جیل کی تاریک،سرد کوٹھڑی میں برہنہ کھڑا تھا اور اس کے جسم پر تازیانے برس رہے تھے۔

"بولو سقراط..."

زہرہ بیگم کی التجا بھری آواز اس کی دھندلی ہوتی سماعت میں واپس لوٹی۔

" کیا تم میرے لیے اتنا کر سکتے ہو؟ نج...نجف نے بھی تو ان دس سالوں میں کہیں شادی نہیں کی۔اسے تمہاری ضرورت ہے...اور اس گھر کو تم دونوں کی ضرورت ہے۔"

سقراط کے گلے کی گلٹی شدّتِ ضبط سے ڈوب کر اوپر ابھری۔اس کا سانس سینے میں بری طرح اٹک رہا تھا۔اس کے لیے اپنی گردن پر چھری چلوانا،اس درخواست کے مقابلے میں ہزار گنا آسان تھا۔جس عورت کی آنکھوں میں اپنے لیے صرف حقارت اور زہر دیکھا ہو،جس نے اسے دنیا کا سب سے گھناؤنا مجرم مان لیا ہو...اس کے ساتھ ایک ہی چھت تلے،ایک ہی رشتے میں بندھنا۔۔۔یہ تو جیتی جاگتی جہنم میں قدم رکھنے کے مترادف تھا۔مگر اس کے سامنے زہرہ بھابھی لیٹی تھیں۔وہ عورت جس نے اسے ماں کی طرح پالا تھا،جس کی زندگی اس وقت آخری سانسوں کی ڈور سے بندھی تھی اور جو اس سے اپنی زندگی کی پہلی اور آخری بھیک مانگ رہی تھیں۔سقراط نے گہرا،تکلیف دہ سانس لیا۔اس کے مضبوط شانوں پر دنیا بھر کا بوجھ آن پڑا تھا۔اس نے اپنی سرخ ہوتی آنکھوں کو زہرہ بیگم کی متبسم اور آس بھری نظروں پر جمایا۔

"آپ اپنی بہن سے پوچھ لیں،بھابھی..."سقراط نے اپنے اندر اٹھتے طوفان کو زبردستی اپنے سپاٹ چہرے کے پیچھے دھکیلا۔ "اگر وہ مانتی ہے....تو مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"

یہ جملہ ادا کرتے ہی سقراط کا اپنا دل جیسے سینے میں مر گیا۔اس نے زہرہ بیگم کے لیے اپنی باقی ماندہ زندگی اور اپنی روح کو بھی نذر کر دیا تھا ایک ایسی آگ میں کودنے کا فیصلہ کر کے جہاں سے اب واپسی کا شاید کوئی راستہ باقی نہیں بچا تھا۔

☆...☆...☆

ڈاکٹرز آفس کی ہلکی نیلی روشنی میں حق اپنے آفس میں تنہا بیٹھا تھا۔اس کے سامنے زہرہ بیگم کی تازہ ترین اینجیوگرافی،ایکوکارڈیوگرام اور خون کی متعدد لیب رپورٹس کھلی پڑی تھیں۔وہ بہت غور سے،ایک ایک عدد اور گراف کو دیکھ رہا تھا مگر اس کے چہرے پر چھائی تاریکی اور پیشانی پر پڑتی گہری شکنیں بتاتی تھیں کہ رپورٹس میں امید کی کوئی کرن نہیں تھی۔

زہرہ بیگم کی حالت گھنٹے بہ گھنٹے تشویشناک ہوتی جا رہی تھی۔ایک ماہر اور تجربہ کار ڈاکٹر ہونے کے ناطے،حق اس بات سے واقف تھا کہ اگر وہ سرجری کی میز پر جائیں تو وہ اپنے ہاتھوں سے کامیاب سرجری کر سکتا تھا مگر پوزیشن یہ تھی کہ اس وقت زہرہ بیگم کا جسم سرجری کے قابل ہی نہیں تھا۔ان کا ہارٹ پمپنگ ریٹ خطرناک حد تک گر چکا تھا اور ان کے آرگنز اتنے کمزور تھے کہ وہ اینستھیزیا اور ہارٹ لنگ مشین کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔حق نے گردن پیچھے ٹیک کر اپنی آنکھیں موند لیں۔اس کے چہرے پر شدید پریشانی اور الجھن کے آثار نمایاں تھے۔اگرچہ آج کے حق کی زہرہ بیگم سے کوئی بہت گہری جذباتی وابستگی باقی نہیں رہی تھی...آج کا حق بالکل بدل چکا تھا۔مگر دس سال پہلے کی بات اور تھی۔دس سال پہلے وہ شبگیر ہاؤس آتا جاتا تھا،اسے زہرہ بیگم سے ایک عجیب سی انسیت تھی۔اور زہرہ بیگم؟ وہ اپنے اس بھتیجے پر جان چھڑکتی تھیں۔وہ ایسی عورت تھیں جنہوں نے ہر رشتے سے محبت کی تھی۔اسی لمحے آفس کے بھاری لکڑی کے دروازے پر مدہم دستک

ہوئی پھر دروازہ ہینڈل سے گھوما اور نجف اندر داخل ہوئی۔حق سیدھا ہو بیٹھا۔نجف کرسی کے کنارے پر بیٹھ گئی۔اس کی نگاہیں سیدھی ان رپورٹس پر جم گئیں جو حق کی میز پر بکھری ہوئی تھیں۔

" کیا اپڈیٹ ہے؟" وہ رپورٹس دیکھ رہی تھی لیکن سوال حق سے پوچھا تھا۔

"ان کی کنڈیشن واقعی بہت کرٹیکل ہے۔ان کے دل کا جو حصہ انفارکشن کا شکار ہوا ہے، وہ کافی بڑا ہے۔"

"تت...تو کیا کوئی سرجری نہیں ہوسکتی؟ اور ہارٹ ٹرانسپلانٹ تم تو اتنے بڑے سرجن ہو حق! تم کچھ کرو نا۔"

"سرجری ہوسکتی ہے اور میں کر بھی سکتا ہوں۔مگر اس وقت ان کے جسم میں اتنی طاقت ہی نہیں ہے کہ وہ سرجری کا سائیڈ افیکٹ جھیل سکیں۔ اس وقت ان کا جسم بائی پاس یا کسی بھی بڑے پروسیجر کے حالات میں نہیں ہے۔اگر ہم نے اس حالت میں سرجری کی، تو ٹیبل پر رسک ۹۰ فیصد سے زیادہ ہو جائے گا۔"

"اور...ان کا ملٹی آرگن فیلیئر کی طرف جانے کا خطرہ اتنا زیادہ ہے کہ ان کا جسم ٹرانسپلانٹ جیسے پیچیدہ عمل کو قبول ہی نہیں کرے گا۔کافی میڈیکل مسائل ہیں جو ایک ساتھ کھڑے ہو چکے ہیں۔"

حق کے ان الفاظ پہ نجف کا چہرہ بالکل فق ہونے لگا۔اس کے اندر جیسے سارا آسرا ایک ہی لمحے میں ٹوٹ کر گر گیا۔

" کیا ہم بس...بس ہاتھ پر ہاتھ دھرے ان کے جانے کا انتظار کریں گے؟" وہ تلخ ہوئی۔آنکھوں میں نمی دیکھی جا سکتی تھی۔وہ ڈاکٹرز تھے۔ روازنہ ایسے ڈھیروں کیس دیکھتے تھے مگر جب باری کسی اپنے کی آتی ہے تو ڈاکٹر کو بھی اتنا ہی درد ہوتا ہے۔

"ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے۔ہم انہیں شدید ادویات اور لائف سپورٹ پر رکھ کر ان کا بلڈ پریشر اور پمپنگ سٹیبل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ وہ اس پوزیشن میں آئیں کہ ہم کوئی رسک لے سکیں۔سمجھ آ رہی ہے نا؟"

نجف نے بس اثبات میں سر ہلا دیا۔وہ گہری سانس لے کر خود کو نارمل کرنے لگی۔ابھی اسے زہرہ بیگم سے ملنا تھا۔وہ رپورٹس وہیں چھوڑ کر

اٹھ کھڑی ہوئی۔

"سلال؟" نجف نے دروازے کے قریب پہنچ کر پلٹ کر دیکھا۔

"وہ سب جانتا ہے۔" حق نے بس اتنا ہی کہا۔ نجف دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ کبھی کبھی ڈاکٹر ہونا بھی کتنا بڑا عذاب ہوتا ہے نا؟ وہ راہداری میں آگے بڑھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ سامنے ہی ایک ڈاکٹر سے بات کرتے ہوئے اسے سلال نظر آیا۔ وہ اپنی ماں کی حالت سے واقف تھا مگر پھر بھی مضبوط دکھائی دیتا تھا۔ اسے اپنے گھر والوں کو، اپنی بہنوں کو سنبھالنا تھا۔ سلال نے ایک نظر نجف کو دیکھا۔ ان نظروں میں بہت کچھ تھا۔ نجف دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔ وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی زہرہ بیگم کے بستر کے پاس آئی اور ان کا سر، ڈرپ لگا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں کے گرم حصار میں تھام کر بیٹھ گئی۔ زہرہ بیگم نے اپنی نقاہت زدہ آنکھیں کھولیں۔ وہ کئی ثانیوں تک بغیر کچھ کہے نجف کے چہرے کو دیکھتی رہیں۔ ان کی نظروں کے سامنے دس سال پرانی وہ شوخ، چمکتے ہوئے اور شاداب چہرے والی نجف گھوم گئی جو کبھی ہنستی تھی تو گھر میں روشنیاں بکھر جاتی تھیں۔ مگر آج... آج ان کے سامنے جو نجف بیٹھی تھی، وہ حد درجہ سنجیدہ، خاموش اور اندھیروں میں لپٹی ہوئی تھی۔ دس سالوں کی تلخیوں اور صدموں نے اس کی مسکراہٹ تک چھین لی تھی۔

" کیسی ہیں آپا؟" وہ مسکرائی۔

"تم تو ڈاکٹر ہو نا؟ تم تو جانتی ہو میں کیسی ہوں؟"

نجف کا دل بھر آیا مگر اس نے خود کو مضبوط رکھا۔ چہرے پر دھیمی سی مسکراہٹ تھی۔

"جی جی میں بالکل جانتی ہوں... آپ بہت جلد گھر جانے والی ہیں اور میں آپ کے گھر آپکے بنے ہاتھ کی بریانی کھانے آؤں گی۔" وہ انہیں بہلانے کی کوشش جر رہی تھی۔ زہرہ بیگم مسکرائی۔

"میں تم سے کچھ مانگوں تو دو گی نجف؟" انہوں نے انتہائی دھیمی آواز میں سوال کیا۔
نجف کے چہرے پر ایک ملائم، ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔

"آپ حکم کریں، آپا؟"

زہرہ بیگم نے ایک لمبا اور تکلیف دہ سانس لیا۔ان کے لیے اپنی اس بہن سے اتنی بڑی قربانی مانگنا پہاڑ کھودنے سے زیادہ مشکل لگ رہا تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ نجف نے پچھلے دس سالوں میں کیا کچھ جھیلا تھا، اس نے نفرت اور اذیت کے کتنے صحرا طے کیے تھے۔اب انہیں ہی کچھ کرنا تھا۔انہوں نے اپنے خشک لبوں کو جنبش دی۔

"تم...تم۔۔۔نجف...تم سقراط سے شادی کرلو...."

زہرہ بیگم کا یہ جملہ پورا ہونا تھا نجف کے چہرے پر موجود وہ نرم مسکراہٹ یوں غائب ہوئی جیسے کسی نے زبردستی چھین لی ہو۔زہرہ بیگم کے ہاتھ پر قائم اس کی گرم گرفت ایک ہی لمحے میں بالکل ڈھیلی پڑ گئی۔اس کا وجود ساکت ہوگیا، سانسیں سینے میں جم گئیں اور وہ شدید حیرت، صدمے اور بے یقینی سے زہرہ بیگم کے زرد چہرے کو تکنے لگی۔

"آپا....؟"

اس کے حلق سے صرف ایک لفظ نکلا، جیسے اسے اپنی سماعتوں پر بالکل یقین نہ آیا ہو۔
زہرہ بیگم کے چہرے پر کرب کی گہری لکیریں ابھریں۔وہ بمشکل بول پا رہی تھیں، ان کا گلا آنسوؤں کے گولوں سے بری طرح رندھ چکا تھا۔

"میری خاطر نجف...میرے گھر کو تمہاری ضرورت ہے!" زہرہ کی آنکھوں سے خاموش آنسو نکل کر ان کی کنپٹیوں پر بہنے لگے۔"میری بچیاں بہت چھوٹی ہیں نجف...میری نیمل کا دکھ بہت بڑا ہے، وہ...وہ...وہ اکیلی یہ سب نہیں سنبھال پائے گی۔اگر مُجھے کچھ ہوگیا تو یہ گھر بکھر جائے گا..."

نجف کے لیے انہیں تکلیف میں دیکھنا کسی عذاب سے کم نہیں تھا۔اس نے تڑپ کر زہرہ بیگم کے ہاتھ پر دوبارہ اپنی گرفت مضبوط کر دی۔ ان کا یہ آخری التجا بھرا روپ اس کا دل چیر رہا تھا مگر وہ جو مانگ رہی تھیں وہ نجف کے لیے اس جیتی جاگتی دنیا میں ناممکن اور جہنم سے بھی زیادہ خوفناک تھا۔نجف کی کوشش کے باوجود اس کے لبوں پر مسکراہٹ نہ آسکی۔اس کا چہرہ اذیت سے مسخ ہونے لگا۔

"سقراط؟ سقراط سے شادی؟"اس نے بالکل بے آواز لہجے میں دہرایا۔زہرہ بیگم نے اس کے کپکپاتے ہاتھ کو ہلکا سا دبایا۔

"مُجھے تمہارے جواب کا انتظار رہے گا،نجف...."

نجف کا ضبط اس آخری جملے پر یکلخت ٹوٹ گیا۔اس کی آواز شدتِ کرب سے بھرا گئی،اس کی آنکھوں میں بدحواسی اور نمی تیرنے لگی۔اس کے گلے میں جیسے سوئیوں کے ساتھ ساتھ ہزاروں زہریلے کانٹے اگ آئے ہوں،جن کی چبھن سے بولنا محال ہو رہا تھا۔

"آپا....آپ چاہتی ہیں کہ میں ایک ریپسٹ سے شادی کروں؟"

نجف کے اس سوال میں دس سال کا درد،رسوائی اور اذیت چھپی تھی۔زہرہ بیگم نے انتہائی تکلیف سے اپنی بند ہوتی آنکھیں کھولیں۔

"وہ گنہگار نہیں ہے نجف...تم اپنے...اپنے دل سے پوچھ لو۔"

زہرہ بیگم بس اتنا ہی کہہ پائیں مگر ان کے ان چند الفاظ نے نجف کے چہرے پر اذیت کے سائے مزید گہرے کر دیے۔اس کے زرد پڑتے لبوں پر تمسخرانہ مسکراہٹ ابھر آئی...ایک ایسی مسکراہٹ جس کے پیچھے ڈھیروں گلے،ڈھیروں شکوے اور ماضی کے گہرے زخم چھپے تھے۔

"میرے پاس میرا دل ہی نہیں ہے،آپا!میں اپنے دل سے کیسے پوچھوں؟"

زہرہ بیگم کی نقاہت زدہ نگاہیں نجف کے تکلیف سے مسخ ہوتے چہرے سے ہٹیں،اور اس کے کانوں کی طرف اٹھ گئیں۔نجف کے بال پیچھے ایک سادہ جوڑے میں بندھے ہوئے تھے،اور اس کے کانوں میں چھوٹے چھوٹے،چمکتے ہوئے سنہرے ٹاپس چمک رہے تھے۔وہ بالکل دھیمی،مدہم سی چمک دے رہے تھے۔ان ٹاپس کو دیکھتے ہی زہرہ بیگم کے چہرے پر حیرت اور وقت کی گرد میں لپٹی ہوئی ایک مدہم پراسرار سی مسکراہٹ ابھر آئی۔وہ جانتی تھیں کہ زبان جو بھی کہے لیکن کائنات کی کچھ سچائیاں چھپائے نہیں چھپتیں۔

"دل جس کا بھی ہو نجف...وہ جھوٹ نہیں بولتا۔بس تم دل سے پوچھ لینا۔"

ان کی اس بات نے نجف کے ہونٹوں کو ہمیشہ کے لیے مقفل کر دیا۔ وہ بستر کے پاس بالکل خاموش، ساکت و جامد بیٹھی رہ گئی۔

☆...☆...☆

شادی ہر عورت کا خواب ہوتی ہے...شاید ہر اس عورت کا جو ایک پرسکون، بوجھ سے آزاد زندگی گزارنا چاہتی ہے۔ اس خواب کی دنیا میں وہ خوش تھی۔ شاید پوری طرح خوش نہیں مگر ایک عجیب سے اطمینان سے سرشار تھی۔ اس کا ہمسفر آج اس کے ساتھ تھا، اسے کسی ایرے غیرے یا ناپسندیدہ شخص سے سمجھوتہ نہیں کرنا پڑا تھا۔ وہ جو چاہتی تھی وہ اس کی تقدیر کے کینوس پر سجا ہوا تھا۔ وہ ہولے سے مسکرا رہی تھی، ایک خوبصورت سے کیک کو انتہائی نفاست سے سجا رہی تھی۔ جس کے اوپر پیپی اینیورسری لکھا ہوا تھا۔ اسکی شادی کو ایک سال ہو چکا تھا۔ اس کا شوہر بس آنے ہی والا تھا۔ اس کی کلائیوں میں بندھا خوبصورت سا بریسلٹ ہلکی سی روشنی میں چمک رہا تھا، اور اس کے دل میں ایک نرم سی سرگوشی تھی کہ زندگی شاید اتنی بھی ظالم نہیں ہوتی۔ مگر جو بات آپا نے کہی تھی...وہ تو عقل سے ماورا، سرے سے ناممکن تھی۔ وہ خیال آتے ہی اس کے ہاتھ کی لرزش آج بھی بڑھ جاتی تھی۔ پھر دروازے پر ایک مدہم سی دستک ہوئی۔ اس نے دھیرے سے کیک سے اپنی نظریں ہٹائیں، اور دروازے کی سمت دیکھیں۔ اس کے قدموں کی چاپ سنتے ہوئے اس کی نگاہیں دھیرے سے دروازے میں کھڑے شخص کے پیروں تک گئیں...اور پھر ایک سحر کے تحت اوپر اٹھنے لگیں۔ اس کے لبوں پر سجی مسکراہٹ گہری ہونے لگی۔ ہاتھوں میں پکڑا سفید پھولوں کا گلدستہ...سینہ چوڑا تھا، کندھے مضبوط اور تنے ہوئے تھے پھر گردن کا وہ متناسب حصہ آیا، اور پھر...پھر چہرہ! چہرہ وجیہہ تھا، تراشیدہ تھا، مگر...وہ شاید اس چہرے کے لیے تیار نہیں تھی۔ ایک پل میں اس کے چہرے کی وہ ساری مسکراہٹ ایسے غائب ہوئی جیسے کسی نے جلتے چراغ پر پھونک ماردی ہو۔ وہ خوف اور دہشت سے لڑکھڑا کر پیچھے ہٹی۔ اس کا توازن بگڑا، وہ پاس رکھی لکڑی کی کرسی سے ٹکرائی، اور ایک ہولناک دھماکے کے ساتھ دھڑام سے زمین پر گر گئی! اسی صدمے، اسی دھچکے کے ساتھ ہسپتال کے کمرے کی کرسی پر بیٹھی نجف ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

اس کا سانس سینے میں اکھڑ رہا تھا، اس کا پورا جسم سرد پسینے میں نہا چکا تھا۔ وہ ایک خواب تھا... ہاں، وہ زندگی کا سب سے بھیانک اور روح فرسا ڈراؤنا خواب تھا۔ اس کا دل کسی اس کے سینے میں اس طرح دھڑک رہا تھا جیسے ابھی پسلیوں کو توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ آپا کی وہ باتیں، اس کے دماغ میں ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھیں۔ وہ گھنٹوں، مسلسل کئی گھنٹوں تک اسی کرسی پر بیٹھی ان الفاظ کو جذب کرتی رہی تھی یہاں تک کہ تھکن، اعصابی ٹوٹ پھوٹ کے بوجھ سے اس کی پلکیں بوجھل ہوگئی تھیں اور وہ میز پر ہی سر رکھ کر سو گئی تھی۔

اوراب...اب جواس نے خواب دیکھا تھا، وہ اتنا اصلی، اتنا حقیقت کے قریب تھا کہ اس کی ہڈیوں تک میں خوف سرایت کر گیا تھا اور خاص طور پر وہ چہرہ! وہ چہرہ جواس کے خواب کے اس دراصل سنسان دریچے میں نمودار ہوا تھا۔

"نہیں...ہرگز نہیں!"

وہ ایک جھٹکے سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔اس کے حواس اب پوری طرح بیدار ہو چکے تھے مگر اس خوف کی سیاہی اب بھی اس کی آنکھوں میں رقص کر رہی تھی۔وہ اس شخص سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔نجف نے اپنے کانپتے ہاتھوں سے اپنے چہرے کو مضبوطی سے ڈھانپ لیا۔ زندگی نے اسے ایک ایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا جہاں موت اس راستے سے کہیں زیادہ آسان لگتی تھی جواس کی آپا نے اس کے لیے چن لیا تھا۔

☆...☆...☆

رات کا ملگجا اندھیرا بزدار پیلس کی عمارت پر پوری طرح چھا چکا تھا۔آج رات کی یہ ملاقات معمول سے ہٹ کر تھی۔نجف نے بالخصوص نشاط کو بھی بلایا تھا۔اسے اپنے ماں باپ اور بہن کی موجودگی میں اپنی زندگی کا ایک انتہائی اہم فیصلہ ان کے گوش گزار کرنا تھا۔نشاط جب پیلس پہنچی تو اس کے چہرے پر ایک خوشگوار سی حیرت تھی۔کافی عرصے بعد نجف نے اسے اس طرح یاد کیا تھا، اور نشاط کے گمان میں یہی تھا کہ شاید نجف نرم پڑ گئی ہے اور وہ صبا کو اس کے شو میں بھیجنے کی اجازت دینے کا کوئی درمیانی راستہ نکالنے والی تھی۔

ڈرائنگ روم کے وسط میں رکھی لمبی میز کی سربراہی کرسی پر امجد بزدار براجمان تھے، اور ان کے بالکل قریب نیلوفر بیگم بیٹھی تھیں۔دوسری جانب، میز کے آخری سرے پر نجف براجمان تھی اور اس سے چند گام کے فاصلے پر نشاط صوفے نما کرسی پر بیٹھی تھی۔نجف کے چہرے پر اس وقت ایک عجیب اور غیر معمولی سکون تھا۔وہ مطمئن اور پُرسکون دکھائی دے رہی تھی۔جیسے اس نے اپنے اندر کے کسی بہت بڑے طوفان کو شکست دے کر، ساحل پر قدم رکھ لیا ہو۔اس کا سیاہ دوپٹہ کندھوں پر قرینے سے پھیلا ہوا تھا اور شہد کے رنگ جیسے گھنے بال ایک جانب کی مانگ نکالے چہرے کے ایک رخ پر گرے ہوئے تھے۔ وہ تینوں اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ان کے سامنے چائے اور لوازمات سجے تھے۔فضا میں ایک ہلکا سا خاندانی اور پُرسکون تاثر تھا۔امجد بزدار اپنی عقابی نگاہوں سے نجف کی اس بدلی ہوئی خاموشی اور اطمینان کو ناپ رہے تھے۔نیلوفر بیگم نے چائے کی پیالی میں چمچ چلاتے ہوئے، ایک دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ فضا کا جمود توڑا۔

"شکر ہے ہماری فیملی بھی سالوں بعد آج یوں ایک ساتھ بیٹھ سکی ہے، ورنہ نجف کے پاس تو ہسپتال کی ڈیوٹیوں کے علاوہ کبھی اپنے ماں باپ

کے ساتھ بیٹھنے کا وقت ہی کہاں ہے۔"

نجف اس دوران چائے کے کپ کے پیندے کو گھور رہی تھی، جہاں گرم چائے کا رنگ ہلکورے لے رہا تھا۔ کپ کے کنارے باریک سنہری سے چمک رہے تھے اور ڈائننگ ہال کی چھت سے لٹکتے بھاری کرسٹل فانوس کی روشنی جب نیچے گرتی تو نجف کے کانوں میں پہنے ہوئے وہ چھوٹے، سنہری ٹاپس بالکل مدہم مدہم سی چمک دیتے تھے۔ اس نے کپ رکھا، ایک گہرا سانس لیا اور اپنی نظریں اٹھا کر باری باری ان تینوں کے چہروں پر جمائیں۔

"میں نے آپ لوگوں کو اس لیے یہاں بلایا ہے تا کہ میں آپ سب کے ساتھ اپنی زندگی کا ایک بہت اہم فیصلہ شیئر کر سکوں۔"

امجد بزدار نے اپنی چائے کی پیالی ڈش پر رکھی اور اس کی طرف دیکھا۔

"اچھا...؟ ایسا کیا خاص ہے بھئی؟"

نجف نے اپنے گردن کو سیدھا کیا بغیر کسی ہچکچاہٹ کے سپاٹ لہجے میں گویا ہوئی۔

"میں شادی کرنا چاہتی ہوں۔"

یہ سننا تھا کہ ڈرائنگ روم میں جیسے خوشی کا ایک ہلکا سا جھونکا آ گیا۔ نیلوفر بیگم کے چہرے پر فوری اور حقیقی خوشگواری پھیلی۔

"واؤ! فائنلی، نجف!" نشاط نے اپنے لمبے بالوں کو ایک جھٹکے سے پیچھے پھینکا اور ہاتھوں کی ایک بے آواز تالی بجائی، "آخر کار تم نے اپنی اس تنہا اور خشک زندگی کو بدلنے کا سوچ ہی لیا ہے۔"

امجد بزدار نے اگرچہ چہرے کے تاثرات سخت رکھے مگر ان کی آنکھوں میں بھی اپنی بیٹی کے اس فیصلے پر ایک پوشیدہ اطمینان ابھرا۔

"کون ہے وہ خوش نصیب؟" نیلوفر بیگم نے بے تابی سے پوچھا، وہ سچ مچ بے حد خوش تھیں۔ نجف نے گہرا سانس لیا۔ ان تینوں کو دیکھا،

بالخصوص امجد بزدار کو، جو اس وقت کسی تجربہ کار شکاری کی طرح اسے جانچتی ہوئی نظروں سے گھور رہے تھے۔
ایک سیکنڈ کے لیے نجف کو اپنے اگلے الفاظ اپنے حلق میں اٹکتے، دم گھٹتے محسوس ہوئے۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ مگر اس تمام تر ہمت جٹائی، اپنے جبڑے بھینچے، اور زہر کو کیسے باہر نکال دیا۔

"میں...سقراط شبگیر سے شادی کر رہی ہوں۔"

سکتہ...ایک ہولناک، گہرا اور دم گھوٹتا ہوا سکتہ چھا گیا۔ نجف کے ان چار بند الفاظ نے گویا بزدار پیلس کی مضبوط اور عالی شان چھت کو باقی تمام افراد کے سروں پر لا پھینکا۔ نیلوفر بیگم کے ہاتھ سے چائے کا کپ چھٹک کر طشتری میں گرتے گرتے بچا، چائے کی گرم بوندیں ان کے ہاتھ پر گریں مگر انہیں احساس نہ ہوا۔ نشاط کے چہرے کا رنگ یوں زرد پڑ کر سیاہ ہوا جیسے کسی نے چہرے سے خون نچوڑ لیا ہو جبکہ امجد بزدار کے چہرے پر شدید حیرت، غضب اور بے یقینی کا ایک ایسا طوفان ابھرا جو انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔

"آپا کی آخری خواہش..." نجف نے اپنے جملے کی وضاحت کرنی چاہی۔

"بکواس بند کرو، نجف!" نیلوفر بیگم کی کاٹ دار چیخ پورے ہال میں گونجی۔ نجف نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے اور نظریں جھکا لیں۔

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے؟" نشاط اپنی جگہ سے اٹھی، اس کا پورا وجود شدتِ جذبات اور غصے سے کپکپا رہا تھا، "تمہاری عقل گھاس چرنے گئی ہے نجف؟ تم...تم ایسا گھٹیا قدم کیسے اٹھا سکتی ہو؟"

"میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے!" نجف کا لہجہ بالکل سرد اور اٹل تھا۔

"تم...تم اس شخص سے شادی کیسے کر سکتی ہو جو تمہاری زندگی کے دس سال کھا گیا؟ جس شخص نے تمہاری بہن کو اتنا بڑا زخم دیا؟" نیلوفر بیگم تو جیسے صدمے میں تھیں۔

"کہا نا میں نے...میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔"

نجف نے نیلوفر بیگم کی بات کاٹ دی، اس کی آواز میں ایسی سنگینی تھی کہ نیلوفر بیگم بھی ایک پل کو ٹھٹھک گئیں۔ امجد بزدار نے اپنے جبڑے اس حد تک بھینچ لیے تھے کہ ان کی کنپٹیوں کی رگیں پھول کر باہر آ گئی تھیں۔ وہ گہرے صدمے اور شدید غصے میں جکڑے اپنی اس بیٹی کو دیکھ رہے تھے۔ انہیں نجف سے اس بغاوت کی امید خواب میں بھی نہیں تھی۔

"میں تمہیں اس بات کی اجازت نہیں دیتا!"

وہ بس اتنا ہی بولے مگر اس ایک جملے میں پورا بزدار خاندان کا اقتدار پھیلا ہوا تھا۔ نجف نے آہستہ سے اپنی پلکیں اٹھائیں اور ان کی غضب ناک آنکھوں میں دیکھا۔

"میں پوچھ نہیں رہی... بتا رہی ہوں۔"

"نجف...!!!"

امجد بزدار اتنی خوفناک آواز میں دھاڑے کہ نیلوفر بیگم اور نشاط دونوں سہم کر اپنی جگہ منجمد ہو گئیں جبکہ نجف نے صدمے اور دباؤ سے بچنے کے لیے اپنی آنکھیں سختی سے میچ لیں اور پھر کھولیں۔

"تم میرے صبر کا امتحان مت لو!" امجد بزدار اپنی نشست سے آگے کو جھکے، ان کی آنکھوں میں آگ کے شعلے لپک رہے تھے، وہ شدید برہم نظر آتے تھے۔

۔

"اگر آپ کو برا لگا ہو تو اس کے لیے معافی چاہتی ہوں... مگر..."

نشاط کو نجف کی اس ناقابلِ یقین ڈھٹائی اور سرد مہری پر شدید حیرت ہوئی۔ اس کی بہن اتنی بے باک کب سے ہو گئی تھی؟

"مگر...میں چاہتی ہوں کہ آپ مُجھے خوشی سے رخصت کریں۔"

"یہ رشتہ کسی صورت نہیں ہوسکتا۔"امجد بزدار نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے حتمی حکم سنایا،"میں زندہ ہوں ابھی!"

نجف نے ایک گہرا سانس لیا۔وہ یہ بات کرنا نہیں چاہتی تھی،وہ یہ جملہ اپنے باپ کے منہ پر نہیں مارنا چاہتی تھی...مگر حالات نے اسے مجبور کردیا تھا اور پھر اس نے خود اپنے لبوں سے اپنے باپ کے سامنے وہ الفاظ ادا ہوتے سنے۔

"اگر آپ مُجھے خوشی سے اجازت نہیں دیں گے...تو میں کورٹ کا رخ کروں گی۔"

امجد بزدار کا دل جیسے ایک لمحے کے لیے دھڑکنا بھول گیا۔انہیں اپنے سینے کے مقام پر شدید جلن اور بوجھ کا احساس ہوا۔ ان کی اپنی بیٹی... ان کی بیٹی انہیں کورٹ میرج کی دھمکی دے رہی تھی؟امجد بزدار کا ذہن سائیں سائیں کرنے لگا۔سالوں پہلے زہرہ ان کے سامنے یوں ہی ڈٹ کر کھڑی ہوئی تھی،اس نے اپنے باپ کے فیصلے کو ٹھکرا کر شوہر کا ہاتھ تھاما تھا...اور آج سالوں بعد...ان کی دوسری بیٹی ان کی انا کے سامنے پاؤں جما کر کھڑی تھی۔

کون سا جادو کرتے تھے یہ شبگیر؟کون سا سحر تھا ان کے پاس کہ بزداروں کی بیٹیاں ان کی خاطر اپنے باپ،اپنے گھر اور اپنے وقار کو ٹھکرا دیتی تھیں؟

نجف نے ان کی اس شکست خوردہ اور شدید برہم حالت کو دیکھا مگر وہ اب پیچھے نہیں ہٹ سکتی تھی۔اس نے اپنے سیاہ دوپٹے کو کندھے پر دوبارہ ٹھیک کیا۔

"زہرہ آپا کے پاس وقت بہت کم ہے...ہمیں یہ نکاح جلد کرنا ہوگا۔"

وہ اپنا جملہ مکمل کر کے،ایک جھٹکے سے اٹھی اور بنا ان کے جواب یا ردِعمل کا انتظار کیے،تیز قدم اٹھاتی ڈرائنگ روم کے شاندار دروازے سے باہر نکلتی چلی گئی۔
اس کے جاتے ہی ہال نما کمرے کی فضا میں جیسے وہ صور غائب ہوگیا جو چند لمحات پہلے پھونکا جا رہا تھا۔نیلوفر بیگم اور نشاط دونوں ہوش میں

آئیں۔وہ دونوں شدید غصے،طیش اور بدحواسی میں ایک ساتھ نجف کی اس بغاوت پر چیخنے چلانے لگیں۔امجد بزدار اپنی کرسی پر بیٹھے، برہم اور شکست خوردہ نظر آرہے تھے۔مگر نجف بزدار بزدار پیلس کی بنیادیں ہلا کر، اپنا فیصلہ سنا کر جا چکی تھی..ایک ایسا فیصلہ جس کی بازگشت اب پورے شہر کو سننی تھی۔

☆...☆...☆

ادھر بزدار پیلس میں طوفان بپا تھا،تو دوسری طرف شبگیر ہاؤس کے لاؤنج میں بھی اس وقت ایک بھیانک خاموشی تھی۔لاؤنج کی زرد روشنی میں ماحول کسی ماتم کدے کا منظر پیش کر رہا تھا۔مرکزی صوفے پر سقراط بیٹھا تھا۔اسکا لباس شکن زدہ تھا۔اس کے بالکل سامنے دادی بیٹھی تھیں،جن کا چہرہ صدمے اور غصے سے بالکل مسخ معلوم ہو رہا تھا۔پاس ہی تارہ،نوفہ،نامرہ اور سلال موجود تھے۔سقراط ہسپتال میں نیمل سے پہلے ہی بات کر چکا تھا۔نیمل نے حالات کا المیہ اور اپنی ماں کی خواہش کو سمجھتے ہوئے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اگر ان دونوں (سقراط اور نجف) کو آپس میں کوئی مسئلہ نہیں ہے تو وہ اور اس کا خاندان اس فیصلے کے راستے میں نہیں آئیں گے۔مگر اب سقراط،کمالہ بیگم (دادی) کو اطلاع دینے آیا تھا اور خبر سنتے ہی دادی بھونچکا رہ گئی تھیں۔

"ہرگز نہیں..."ان کے لہجے میں زہر گھل گیا۔

"تم اس لڑکی سے شادی نہیں کرو گے سقراط!ہرگز نہیں!"

دادی کو نجف زہر لگتی تھی۔دس سال پہلے جس طرح نجف،نشاط اور امجد بزدار نے سقراط کی زندگی برباد کی تھی،اسے جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیلا تھا۔دادی وہ رسوائی،وہ ذلت اور اپنے بیٹے کی بربادی کا ایک لمحہ بھی نہیں بھولی تھیں۔وہ اس لڑکی کا نام بھی اپنے گھر میں سننے کی روادار نہیں تھیں۔سقراط کا چہرہ بالکل سپاٹ اور پتھر کی طرح سخت رہا۔تارہ اور نوفہ قدرے حیران تھیں جبکہ نامرہ کے چہرے پر بھی دادی جیسی ہی شدید ناگواری پھیلی ہوئی تھی۔وہ اس وقت ایک سادہ سے جوڑے میں ملبوس تھی۔پہلی بار کسی نے اسے گھر میں اتنے ڈھنگ اور نفاست کے کپڑوں میں دیکھا تھا۔اس کے کھلے رہنے والے بال آج ایک مضبوط چٹیا میں بندھے ہوئے تھے اور اس تلخ حقیقت نے اسے ایک دم ہی بچی سے سنجیدہ لڑکی میں بدل گیا تھا۔

"میں آپ سے مشورہ مانگنے نہیں آیا، میں آپ کو اپنا فیصلہ سنا رہا ہوں۔"

"سقراط! اگر تم نے اس لڑکی سے شادی کی...تو تم میرا مرا ہوا منہ دیکھو گے۔"

آخر میں دادی کی آواز شدّتِ ضبط اور صدمے سے بالکل بھرا گئی۔انہوں نے اپنی نم آنکھوں پر اپنے دوپٹے کا پلو رکھا، اور ان کا بوڑھا وجود تھر تھر کپکپانے لگا۔سقراط کے لب سختی سے بھینچ گئے۔اس نے سرخ آنکھیں اٹھا کر اپنی ماں کو دیکھا۔اسے اپنی ماں سے ڈھیروں شکوے، ڈھیروں گلے تھے۔ماضی میں جب اس پر الزام لگا تھا تو سب سے پہلے اسی ماں کا مان ٹوٹا تھا، اسی گھر نے اسے بے گناہ ثابت کرنے کے بجائے تنہا چھوڑ دیا تھا۔مگر وہ کبھی زبان سے کچھ نہیں کہتا تھا۔ابھی بھی، وہ بس خاموشی اپنی ماں کے اس روپ کو دیکھے گیا۔

"انہوں نے اتنا کچھ کیا ہمارے ساتھ..." دادی نے دوپٹہ ہٹا کر دباؤ سے کہا، "ہمارے ہنسے بستے گھر کو ویران کر دیا، تمہیں جیل بھیجا، اتنا ذلیل کیا اور تم پھر ان سے رشتہ جوڑنے چلے ہو؟ کچھ تو خودداری رکھو سقراط...تم اتنے بے غیرت کب سے ہو گئے؟"
الفاظ اتنے سخت، اتنے زہریلے اور دل چیرنے والے تھے کہ دادی کے پیچھے کھڑے سلال کو شدید تاسف ہوا۔سلال فوراً آگے بڑھا اور اس نے دادی کے کانپتے ہوئے شانوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھے۔

"دادی، پلیز! آپ چاچو کی بات تو سن لیں...حالات ایسے ہیں کہ..."

"ارے سن لی میں نے بات!" دادی نے جھٹکے سے سلال کا ہاتھ پیچھے دھکیلا، "وہ لڑکی اس گھر میں میری بہو بن کر کبھی نہیں آئے گی۔"

"دادی بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" نامرہ نے اپنی سوجھی ہوئی آنکھوں سے سقراط کو دیکھتے ہوئے کڑواہٹ سے کہا، "ہمیں ان سے کوئی رشتہ نہیں رکھنا۔وہ لوگ ظالم ہیں۔"

سقراط نے نامرہ کی کڑواہٹ اور دادی کے زہریلے جملوں پر اپنی پلک بھی نہیں جھپکائی۔
زندگی نے اسے ایک ایسے عجیب اور خوفناک دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا جہاں ایک طرف ماں تھی اور دوسری طرف بھابھی کی ڈوبتی ہوئی سانسیں اور خواہش تھی۔

"میں یہاں اجازت لینے نہیں آیا۔" سقراط ایک جھٹکے سے صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔
"میں فیصلہ کر چکا ہوں اور آپ سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ سقراط شبگیر کبھی اپنے فیصلے نہیں بدلتا۔"

وہ بس گھر والوں کو بتانے آیا تھا تا کہ وہ آنے والے طوفان کے لیے خود کو تیار رکھیں۔

"سقراط..." دادی نے بے یقینی، صدمے اور ٹوٹے ہوئے مان سے اسے پکارا۔

"مُجھے معاف کیجیے گا لیکن یہ ناگزیر ہے۔"

وہ بنا کسی کا جواب سنے تیز قدموں سے باہر کی طرف نکل گیا۔ سلال فوراً اسکے پیچھے لپکا۔ نیمل نے تو اس رشتے کی منظوری دے دی تھی، مگر سرمد صاحب؟ ہسپتال کے باہر جب سرمد صاحب کو اس فیصلے کا پتا چلا، تو ان کا ردِعمل بھی دادی سے مختلف نہیں تھا۔ وہ اس خاندان سے رشتہ کیسے جوڑتے جس نے ان کی بیوی کو عاق کر دیا تھا اور کبھی پلٹ کر خبر تک نہیں کہ تھی؟ مگر تقدیر کا ستم دیکھیے کہ حالات کی باگ ڈور ان بزرگوں کے ہاتھوں سے نکل چکی تھی۔ چاہے دادی روئیں، چاہے سرمد صاحب تڑپیں، یا امجد بزدار دھاڑیں... ہونا وہی تھا جو نجف بزدار اور سقراط شبگیر نے طے کر لیا تھا۔ ایک ایسا بندھن جو محبت کا نہیں بلکہ پچھتاووں، انتقام اور آخری خواہش پر باندھا جا رہا تھا۔

☆...☆...☆

شبگیر ہاؤس پر اس وقت ایک ایسی خاموشی کا راج تھا جو صرف آوازوں کی کمی سے نہیں بلکہ خوشیوں کے مر جانے سے پیدا ہوتی ہے۔ چند دن پہلے تک یہی گھر روشنیوں، مہندی کی خوشبو، ہنسی، قہقہوں اور رخصتی کے گیتوں سے گونج رہا تھا۔ آج وہی لاؤنج سنسان پڑا تھا۔ صوفوں پر رکھے رنگ برنگے کشن بے ترتیب تھے، کونے میں رکھا پھولوں کا ایک گلدستہ مرجھانا شروع ہو چکا تھا اور دیواروں پر لگی سنہری لائٹس بجھ جانے کے باوجود اب تک اتاری نہیں گئی تھیں۔ اوپر والے لاؤنج میں، کھڑکی کے قریب رکھے بڑے سے پنجرے میں چغلی خان ایک ٹانگ پر کھڑا اپنی سرخ چونچ سے پروں کو سنوارنے میں مصروف تھا۔ وہ پہلے سے بہت زیادہ خاموش ہو گیا تھا۔ اب کسی سے بات ہی نہیں کرتا تھا۔ گھر میں محلے والوں کا، عیادت کے لیے آنا جانا لگا رہتا تھا اس لیے اسے اوپر شفٹ کر دیا گیا۔ اسی وقت چھوٹے چھوٹے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ نوفہ ایک پلیٹ میں سورج مکھی کے بیج، انار کے دانے اور بادام کی باریک قتلیاں لیے آہستہ آہستہ پنجرے تک آئی۔ اس کا گول مٹول چہرہ کئی دنوں کی بے خوابی سے مرجھا گیا تھا۔ آنکھیں سوجھی ہوئی تھیں مگر وہ پھر بھی اپنے چہرے پر زبردستی مسکراہٹ سجانے کی کوشش کر

رہی تھی۔اس نے پنجرہ کھولا اور ہتھیلی آگے بڑھادی۔

"آجاؤ چغلی خان...آج تمہارا کا فیورٹ مینو ہے۔"

چغلی خان نے گردن ٹیڑھی کی،ایک نظر نوفہ کو دیکھا پھر پھدک کر اس کی ہتھیلی پر آبیٹھا۔نوفہ ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"واہ...آج تو بڑے شریف بن رہے ہو۔ورنہ پہلے تو پہلے انگلی کاٹتے تھے،پھر کھانا کھاتے تھے۔"

چغلی خان نے ایک بیج چونچ میں دبایا اور حسبِ عادت گردن ہلا کر بولا۔

"نوفی...نوفی..."

نوفہ کی آنکھیں نرم پڑ گئیں۔"ہاں...میں ہی ہوں۔"وہ اس کی چونچ کے قریب ایک ایک دانہ کرتی رہی۔

"پتا ہے چغلی خان..."اس نے آہستہ سے کہنا شروع کیا۔" گھر بہت عجیب لگ رہا ہے۔"چغلی خان خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔"امی نہیں ہیں نا..."یہ کہتے ہوئے اس کی آواز خود بخود دھیمی ہوگئی۔

"مُجھے تو لگتا تھا امی صرف کھانا بناتی ہیں..."وہ ہلکا سا مسکرائی مگر فوراً وہ مسکراہٹ بجھ گئی۔"لیکن اب پتا چلا ہے امی تو پورا گھر چلاتی تھیں۔"

"امی...امی...کیسی ہے امی..."چغلی خان نے اپنی باریک سی اواز میں سوال کیا۔

"ٹھیک نہیں ہیں۔"نوفہ نے بھرائی آواز میں کہا۔اور ادھر اُدھر نظر دوڑائی۔

"دادی کی دوائیاں وقت پر کوئی نہیں دیتا...نامرہ کوشش کر رہی ہے۔پاپا ہر وقت ہسپتال میں ہوتے ہیں۔تارہ کو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے اور نیمل آپی...وہ تو بالکل پہلے جیسی ہی نہیں رہیں۔"

چغلی خان نے چونچ سے اس کی انگلی کو ہلکا سا چھوا۔شاید ہمدردی جتانے کا طریقہ تھا۔

"چغلی خان..."نوفہ نے اس کے سر پر انگلی پھیری۔"تمہیں پتا ہے نا...نیمل آپی کی شادی بھی ٹوٹ گئی۔"اس نے گہرا سانس لیا۔صرف چغلی خان کے بیج توڑنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔پھر نوفہ نے دھیرے سے کہا۔

"اور ایک بات بتاؤں؟"وہ ذرا سا اس کے قریب ہوئی جیسے کوئی بہت بڑا راز بتانے لگی ہو۔"نجف خالہ..."وہ رکی۔"مُجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔"اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔پھر اچانک اس کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔

"لیکن...گھر میں سب انہیں پسند نہیں کرتے۔"چغلی خان نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔"خالہ...خالہ..."

"ہاں خالہ...دادی اماں تو شاید کبھی نہ مانیں..."اس نے افسردگی سے کہا۔

"اگر واقعی نجف خالہ اس گھر میں شادی کر کے آ گئیں...تو ان کے لیے بہت مشکل ہو گی نا؟"

چغلی خان خاموش تھا۔نوفہ خود ہی جواب دینے لگی۔

"لیکن...اگر چاچو ان سے نفرت نہ کریں...تو شاید سب ٹھیک ہو جائے۔"

"چاچو...شیر...چاچو...شیر..."چغلی خان چلا اٹھا۔

"ہاں چاچو بہت اچھے ہیں۔"نوفہ نے یقین سے کہا۔"وہ غصے والے ضرور ہیں...لیکن برے نہیں ہیں۔مُجھے لگتا ہے...اگر یہ دونوں ایک دوسرے سے نفرت نہ کریں تو شاید پورا گھر بھی آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے۔"

اسی لمحے چغلی خان نے اچانک گردن ہلائی اور نہایت سنجیدہ انداز میں بولا۔

"نفرت...نفرت..."

نوفہ نم آنکھوں سے مسکرادی۔"بس یہی لفظ سیکھنا رہ گیا تھا تمہارا!"

چغلی خان نے فوراً دوسرا جملہ دہرایا،"امی...امی..."

اس ایک لفظ نے جیسے پورے ماحول کی ہوا بدل دی۔نوفہ کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔
اس نے نظریں جھکالیں۔

"ہاں..."اس کی آواز بھرا گئی۔"امی..."اس کی آنکھوں سے خاموشی سے دو آنسو ٹپک کر ہتھیلی پر گر پڑے۔

"پتا نہیں..."اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔"امی گھر کب آئیں گی۔وہ جلدی ٹھیک ہو جائیں گی نا؟"

یہ سوال اس نے چغلی خان سے کیا تھا مگر حقیقت میں وہ جواب اپنے رب سے مانگ رہی تھی۔چغلی خان نے چونچ میں ایک دانہ دبایا،گردن ہلائی اور جیسے ہمیشہ زہرہ بیگم کے پیچھے پیچھے رہتا تھا،ویسے ہی معصوم لہجے میں دادی کی نقل اتاری۔

"زہرہ...زہرہ..."یہ ایک لفظ سنتے ہی نوفہ کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔اس نے چغلی خان کو آہستگی سے اپنے سینے سے لگالیا۔

"ہم سب کو امی کی بہت یاد آرہی ہے،چغلی خان..."اس نے سسکتے ہوئے کہا۔
"تم بھی دعا کرو...اس گھر کو اس کی زہرہ واپس مل جائے۔امی جلدی واپس آجائیں۔"

☆...☆...☆

آؤٹ ڈور پیشنٹ ڈیپارٹمنٹ (OPD) حسبِ معمول شور اور مصروفیت سے بھرا ہوا تھا۔کہیں بچوں کے رونے کی آوازیں تھیں،کہیں

مریض اپنی رپورٹس ہاتھوں میں لیے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔نرسیں ایک بیڈ سے دوسرے بیڈ کی طرف دوڑ رہی تھیں،فون مسلسل بج رہے تھے اور فائلوں کی سرسراہٹ اس ہنگامے میں ایک الگ شور پیدا کر رہی تھی۔اس تمام افراتفری کے بیچ،ڈاکٹر نجف سفید کوٹ میں ملبوس، گلے میں سٹیتھوسکوپ ڈالے، غیر معمولی خاموشی کے ساتھ ایک کے بعد ایک مریض دیکھ رہی تھی۔آج اسکی ڈیوٹی آوٹ ڈور میں تھی۔ اس کے ہاتھ حسبِ معمول مہارت سے چل رہے تھے۔بلڈ پریشر چیک کرنا...رپورٹ پر دستخط کرنا...دوائیں لکھنا...مریض کو تسلی دینا... سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔صرف ایک چیز معمول پر نہیں تھی...نجف خود! گزشتہ کئی راتوں سے وہ بمشکل چنڈ گھنٹے سوئی تھی۔زہرہ آپا کی آخری خواہش...اور سقراط شبگیر سے نکاح! یہ ایک ایسا خیال تھا جو ہر چند منٹ بعد اس کے ذہن پر ہتھوڑے کی طرح گرتا اور اسے اندر سے توڑ دیتا۔لیکن وہ ڈاکٹر تھی۔

اور ڈاکٹر اپنے ذاتی دکھوں کو دستانوں کے ساتھ ہاتھوں میں پہن کر مریضوں کے سامنے نہیں جاتے۔اس نے اپنی تمام تکلیف کو سفید کوٹ کی جیبوں میں دفن کر رکھا تھا۔

دوپہر کے قریب جب مریضوں کا رش کچھ کم ہوا تو نجف نے کرسی کی پشت سے سر ٹکایا۔اس نے آنکھیں بند کیں۔کنپٹیوں میں مسلسل دھڑکتا درد اب ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا تھا۔اسی لمحے کیبن کا دروازہ ہلکے سے کھلا۔

"May I?"

نجف نے آنکھیں کھولیں۔سامنے ڈاکٹر اعظم کھڑا تھا۔اس کے ہاتھ میں کافی کے دو کپ تھے۔اعظم کی میڈیکل ڈیپارٹمنٹ میں نئی تعیناتی ہوئی تھی مگر میڈیکل کالج کے زمانے سے وہ نجف کو جانتا تھا۔وہ دونوں کلاس فیلوز تھے۔اعظم اپنی شائستگی کے لیے جانا جاتا تھا۔وہ اندر آیا اور خاموشی سے ایک کپ اس کی میز پر رکھ دیا۔

"مُجھے لگا شاید آج تم نے پھر لنچ اسکپ کر دیا ہوگا۔" نجف نے کافی کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

"شکریہ..."

بس اتنا کہہ کر وہ دوبارہ اپنی فائل بند کرنے لگی۔اعظم نے اسے غور سے دیکھا۔

"تم ٹھیک نہیں لگ رہیں۔"

نجف نے مصنوعی مسکراہٹ لبوں پر لانے کی کوشش کی۔"میں بالکل ٹھیک ہوں۔"
اعظم ہلکا سا مسکرایا۔

"یہ جملہ ہر وہ ڈاکٹر بولتا ہے جو سب سے زیادہ بیمار ہوتا ہے۔"

نجف چند لمحوں کے لیے خاموش ہوگئی۔اعظم کی نگاہیں اس کے چہرے پر جم گئیں۔

"حق سے میری بات ہوئی تھی..."وہ دھیرے سے بولا۔

نجف کے ہاتھ غیر محسوس انداز میں رک گئے۔

"اس نے بتایا...حالت ابھی بھی نازک ہے۔"

خاموشی چھا گئی۔اعظم نے نرم لہجے میں کہنا شروع کیا۔

"نجف...اگر تم چاہو تو آج کی ایوننگ شفٹ میں تمہاری جگہ میں بیٹھ جاتا ہوں۔"

نجف نے فوراً سر اٹھایا۔"نہیں ضرورت نہیں۔"وہ الجھی ہوئی تھی اور اسکی پریشانی اسکے رویے پہ بھی اثر انداز ہو رہی تھی۔اعظم چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔

"تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو...تو مُجھے بتا دینا۔"

نجف نے گہرا سانس لیا۔"آپ واقعی اچھے انسان ہیں ڈاکٹر اعظم..."اس کی آواز اب پہلے سے نرم تھی۔

"لیکن کچھ جنگیں ایسی ہوتی ہیں جن میں کوئی دوسرا ساتھ نہیں چل سکتا۔"

ڈاکٹر اعظم نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ نجف صرف اپنی بہن کی بیماری کی وجہ سے ڈسٹرب تھی لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے سامنے بیٹھی عورت کی پوری زندگی ایک ایسے فیصلے کے دہانے پر کھڑی تھی جسے وہ اپنی موت سے بھی زیادہ خوفناک سمجھتی تھی۔ اعظم نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

"چلو کم از کم کافی ہی پی لو۔"

نجف نے کپ کو ایک نظر دیکھا۔ پھر دھیرے سے اسے واپس اس کی طرف سرکا دیا۔

"کافی میرے اعصاب کو سکون نہیں دے سکتی..."

اس ایک جملے میں ایسی تھکن تھی کہ اعظم مزید کچھ نہ کہہ سکا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"ٹیک کیئر..." وہ شائستگی سے مسکرا کر چلا گیا۔ نجف نے صرف سر ہلا دیا۔ دروازہ بند ہوا... اور کیبن دوبارہ خاموش ہوگئی۔ کافی وہیں پڑی رہ گئی۔ نجف کئی لمحوں تک کرسی پر بیٹھی رہی۔ پھر اس نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی۔ پھر وہ اٹھی۔ سفید کوٹ سیدھا کیا۔ سٹیتھوسکوپ میز پر رکھا۔ فائل بند کی۔ وہ کیبن سے باہر نکل آئی۔

اب اسے کسی مریض کا علاج نہیں کرنا تھا۔ اب اسے اپنی زندگی کے سب سے پرانے زخم کا سامنا کرنا تھا۔ سقراط شبگیر ...وہی شخص جس کا نام سنتے ہی دس سال پرانی چیخیں آج بھی اس کے کانوں میں گونجنے لگتی تھیں۔ نجف نے اپنے چہرے پر ایک سرد سا نقاب چڑھایا اور تیز قدموں سے کاریڈور بلاک کی طرف بڑھ گئی... جہاں ایک اور فیصلہ... اس کی منتظر کھڑا تھا۔ بلاک کا طویل، سفید کوریڈور کافی مصروف تھا۔ چھت پر لگی فلورو سینٹ لائٹس کی مدھم روشنی سفید فرش پر پھیل رہی تھی۔

نجف تیز قدموں سے چلتی ہوئی لان میں داخل ہوئی۔ اس نے نیمل کے ہاتھوں سقراط سے لان میں ملنے کا کہا تھا۔ سقراط شبگیر وہیں کھڑا تھا۔ دونوں ہاتھ جیبوں میں تھے۔ کندھے سیدھے تھے۔ نجف کے قدموں کی چاپ سن کر اس نے آہستگی سے سر موڑا۔

بس اتنا ہی۔ نہ حیرت... نہ سوال... نہ شکوہ... صرف خاموش، گہری نظریں۔ نجف اس کے سامنے آ کر رک گئی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ

سفید کوٹ کی جیبوں میں چھپا لیے۔انگلیاں بری طرح کانپ رہی تھیں۔وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔مضبوط جسامت والا مرد اور سفید کوٹ والی عورت! کئی لمحے دونوں کے درمیان صرف خاموشی کھڑی رہی۔پھر نجف نے گہرا سانس لیا۔

"مُجھے تم سے ایک بات کرنی ہے..."سقراط نے صرف اس کی طرف دیکھا۔
"بولو۔"بس ایک لفظ۔اتنا سادہ...اتنا بے رنگ...کہ نجف کو محسوس ہوا جیسے وہ کسی دیوار سے بات کرنے آئی ہو۔اس نے اپنے جبڑے بھینچے۔

"یہ شادی..."اس کی آواز سخت تھی۔"صرف زہرہ آپا کے لیے ہو رہی ہے۔"

خاموشی۔

"صرف ان کی خاطر۔"

خاموشی۔

"اس کے علاوہ اس رشتے کی میری نظر میں کوئی حیثیت نہیں۔"

سقراط نے پلک بھی نہ جھپکی۔نجف نے محسوس کیا جیسے وہ بول ضرور رہی تھی مگر اس کے الفاظ سامنے کھڑے آدمی سے ٹکرا کر کہیں جذب ہو رہے تھے۔ اس نے لہجہ مزید سخت کر لیا۔

"صرف نکاح ہوگا۔نہ رخصتی۔نہ ازدواجی زندگی۔میں بزدار پیلس ہی رہوں گی۔جب آپا مکمل صحت یاب ہو جائیں گی..."

وہ ایک لمحہ رکی۔"ہم یہ نکاح ختم کر دیں گے۔"اس نے سیدھا سقراط کی آنکھوں میں دیکھا۔

"اور ایک بات...یہ غلط فہمی کبھی مت پالنا کہ میں تمہیں اپنی زندگی میں جگہ دوں گی۔"

فضاایک بار پھر خاموش ہوگئی۔ نجف انتظار کرتی رہی۔وہ چاہتی تھی سقراط غصہ کرے۔اس سے بحث کرے۔اسے روکے۔اسے جواب دے۔اس شادی سے انکار کردے یا کم ازکم...اپنی بے گناہی ہی بیان کرے۔لیکن...کچھ نہیں ہوا۔سقراط اسی سکون سے کھڑا رہا۔اس کی نظریں نجف کے چہرے پر تھیں۔مگران نگاہوں میں نہ نفرت تھی...نہ محبت...بلکہ ایک ایسی تھکن تھی جو برسوں کی سزا کاٹنے والوں کی آنکھوں میں اتر آتی ہے۔سقراط نے آہستہ سے ایک گہرا سانس لیا۔اس کے حلق کی گلٹی شدتِ ضبط سے اوپر نیچے ہوئی۔اس نے نظریں ایک لمحے کے لیے دوسری جانب پھیرلیں پھر دوبارہ نجف کی طرف دیکھا۔"اور کچھ؟"

نجف لمحہ بھر کو ٹھٹکی۔اسے توقع نہیں تھی کہ اس کے تمام زہریلے جملوں کے بعد جواب صرف دولفظ ہوں گے۔

"بس..."وہ دھیمی آواز میں بولی۔"اتنا ہی۔"

سقراط نے سر ہلایا۔"ٹھیک ہے۔"

نجف کی پیشانی پر شکن ابھری۔"بس...ٹھیک ہے؟"

سقراط کے چہرے پر ہلکی سی حرکت ہوئی۔وہ نہ مسکرایا۔نہ غصہ ہوا۔

"ڈاکٹر نجف بزدار صاحبہ...میں نے تمہاری ایک ایک شرط سن لی ہے۔اور مُجھے ان میں سے کسی پر کوئی اعتراض نہیں۔"اس کی آواز غیر معمولی حد تک دھیمی اور بھاری تھی۔وہ چند لمحے خاموش رہا۔"بس مُجھے اپنی شکل مت دکھایئے گا۔"

نجف کے اندر جیسے کسی نے ایک لمحے کے لیے تمام آوازیں بند کردیں۔وہ ساکت رہ گئی۔ وہ جیتنے آئی تھی...لیکن سامنے کھڑا شخص لڑ ہی نہیں رہا تھا۔اور بعض اوقات...لڑنے والے سے زیادہ خوفناک وہ انسان ہوتا ہے جو ہر الزام، ہر شرط اور ہر تکلیف کو خاموشی سے قبول کرلے۔

☆...☆...☆

بزدار پیلس کے مرکزی بیڈروم میں رات کا بھیانک سیاہ اندھیرا اب صبح کے کافوری اجالے میں بدل رہا تھا۔مگر اس شاندار کمرے میں پھیلا ہوا تناؤ اور گھٹن اتنی ہی شدید تھی جتنی رات کے آخری پہر میں تھی۔امجد بزدار اپنے نائٹ گاؤن میں ملبوس، مطالعے کی کرسی سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ان کی آنکھوں میں سرخ ڈورے تیر رہے تھے۔کمرے میں نیلوفر بیگم مسلسل بے چینی سے چکر کاٹ رہی تھیں۔چہرے پر شدید طیش اور خوف کے تاثرات ابھر رہے تھے۔

"نجف یہ شادی کسی صورت نہیں کر سکتی!"

نیلوفر بیگم کی آواز میں زہر اور ضد گھلی ہوئی تھی۔وہ امجد بزدار کے بالکل سامنے آ کر کھڑی ہو گئیں۔ "آپ سن رہے ہیں امجد؟ میں اپنی بیٹی کو اس بدنامی کی دلدل میں کودنے نہیں دوں گی۔اس کی عقل ماری گئی ہے لیکن آپ...آپ خاموش کیسے بیٹھ سکتے ہیں؟"

امجد بزدار نے کوئی جواب نہیں دیا۔وہ خاموشی سے اپنے گھٹنے پر جمے ہاتھوں کو دیکھتے رہے،جن کی ناخنوں کی چمک غائب ہو چکی تھی۔ان کا یہ برفانی سکوت نیلوفر بیگم کو اندر تک جلا رہا تھا۔

"آپ کچھ بولتے کیوں نہیں ہیں؟" نیلوفر بیگم کا پورا وجود غصے اور مایوسی سے کپکپا رہا تھا۔
"آپ یوں مجسمہ بن کر کیوں بیٹھے ہیں؟ آپ کو اندازہ بھی ہے کہ اگر یہ نکاح ہو گیا تو اس شہر میں ہماری کتنی بدنامی ہو گی؟ لوگ ہمارے منہ پر تھوکیں گے۔کہیں گے کہ امجد بزدار کی بیٹی اسی شخص کی زلفوں کی اسیر ہو گئی جس نے ان کی عزت پر داغ لگایا تھا۔ہم سوسائٹی میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔"

نیلوفر بیگم کا غصہ،ان کے الفاظ قیمتی دیواروں سے ٹکرا کر واپس لوٹ رہے تھے مگر امجد بزدار کے چہرے کا تاثر نہیں بدلا۔وہ گھاگ آدمی تھے۔یقیناً انہوں نے کچھ نہ کچھ سوچ لیا تھا تبھی خاموش تھے۔انہوں نے انتہائی آہستگی سے اپنا سر اٹھایا۔

"اولاد جوان ہو جائے نیلوفر...تو اس سے مقابلہ نہیں کیا جاتا۔"

انہوں نے ایک لمبا سانس لیا اور نیلوفر بیگم کی تپتی ہوئی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حقیقت کا تلخ سچ ان کے سامنے رکھ دیا۔

"اگر میں اسے اس شادی کی اجازت نہیں دوں گا...تو وہ کورٹ چلی جائے گی!اور اگر نجف بزدار نے کورٹ میرج کا رخ کرلیا،تب اس خاندان کی جتنی بدنامی اور رسوائی ہوگی،تم اس کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتیں!"

انہوں نے اپنی خشک ہتھیلیوں کو آپس میں رگڑا اور بات جاری رکھی۔

"چار دن بعد میڈیا،قانون اور یہ پورا شہر ہمارے گریبان پر ہاتھ ڈالے گا۔وہ عدالت میں کھڑے ہوکر اپنے باپ کے خلاف بیان دے گی اور تب بزدار پیلس کی عزت کا جو جنازہ اٹھے گا،اسے ہم کبھی دفنا نہیں پائیں گے۔میں نے اسے پال کر بڑا کیا ہے،میں اس کا ضدی اور کٹھور پن اچھی طرح جانتا ہوں...وہ جو کہتی ہے،وہ کر گزرتی ہے۔اور میں اسے یہ سب کرنے کے لیے مجبور نہیں کرنا چاہتا۔"

ان کے ذہن میں جو بھی ہو لیکن زبان سے وہی الفاظ نکل رہے تھے جو انہیں ایک اچھا باپ ثابت کرتے۔انکے ان چند الفاظ نے جیسے نیلوفر بیگم پر یخ بستہ پانی انڈیل دیا ہو۔ان کا وہ تمام طیش اور وہ غصہ ایک ہی سیکنڈ میں جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔نیلوفر بیگم کے قدم لڑکھڑائے اور وہ پاس پڑی صوفے کی کرسی پر بے دم ہوکر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئیں۔ان کا چہرہ بالکل فق ہو چکا تھا۔انہیں اس بات کا سب سے بڑا صدمہ ہوا تھا کہ امجد بزدار نے اس کڑوی اور ہولناک حقیقت کو تسلیم کرلیا تھا۔ انہوں نے نجف کی بغاوت کے سامنے اپنے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

"تت...تو کیا آپ...آپ اسے اس درندے کے ساتھ جانے دیں گے؟"نیلوفر بیگم کی آواز بالکل دھیمی اور سسکی میں بدل چکی تھی۔

امجد بزدار نے اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کر اپنے ہاتھ پشت پر باندھ لیے۔کھڑکی سے باہر پھیلا ہوا بزدار پیلس کا سرسبز باغیچہ اب انہیں کسی ویرانے کی طرح نظر آرہا تھا۔

"وہ جا نہیں رہی نیلوفر..."امجد بزدار نے بغیر مڑے سرد لہجے میں کہا،"وہ صرف اس کے نام کا طوق اپنے گلے میں ڈال رہی ہے۔اور یہ ڈرامہ کب تک چلتا ہے،یہ میں بھی دیکھوں گا۔لیکن فی الحال...ہمیں اس زہر کو نگلنا ہی پڑے گا۔"

نیلوفر بیگم بس ان کی پشت دیکھ کر رہ گئیں۔یہ تو طے تھا وہ نجف کو اس فیصلے کے لیے کبھی معاف نہیں کرنے والی تھیں۔

☆...☆...☆

بزدار پیلس کی کھلی دالان اوراس سے متصل وسیع وعریض لان پراس وقت عصر کے ڈھلتے سورج کی زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی۔نجف کافی دنوں کی مسلسل ہسپتال کی ڈیوٹی،گھر کی ہنگامہ آرائی اور ذہنی تھکن کے بعد آج کچھ دیر کے لیے بزدار پیلس آئی تھی۔وہ شاور لے کر،تازہ دم ہوکر نیچے آئی تھی اوراسے کچھ ہی دیر میں دوبارہ ہسپتال کے اسی کرب ناک ماحول میں واپس لوٹنا تھا۔ان کی جانب والے حصے کے لان میں بچے کھیل رہے تھے۔اقبال کے دو بچوں کے ساتھ کامل بھی تھا جو اپنی آیا کی دیکھ بھال میں گھاس پر گیند کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔کبھی کبھی اسے سنبھالنا بہت مشکل ہو جاتا تھا مگر اس وقت بچوں کے ساتھ اس کی بے ساختہ ہنسی اور معصوم شرارتیں فضا میں ایک عجیب سا سکون گھول رہی تھیں۔بچوں کی ان نادان کھلکھلاہٹوں کو دیکھ کر نجف کے پچھلے کئی دنوں سے تنے ہوئے اعصاب لمحہ بھر کو ڈھیلے پڑ گئے۔اس کے چہرے کی سختی میں ایک نرمی سی حل ہوئی۔اسی اثنا میں،حق بھی کافی دنوں بعد بزدار پیلس کے اس حصے کی طرف آیا تھا۔وہ دراصل کامل کو لینے آیا تھا کیونکہ ہسپتال اور خاندانی الجھنوں کی وجہ سے وہ اپنے بیٹے کو پورا وقت نہیں دے پا رہا تھا۔اس نے نجف کو دیکھا تو اسکے قدم نجف کی طرف بڑھ گئے۔وہ نجف کے قریب آیا اور بغیر کسی تمہید کے،میز کے پاس رکھی ایک کرسی کھینچ کر نجف کے بالکل سامنے بیٹھ گیا۔
شروع میں ان کے درمیان کچھ منٹ بالکل عام اور رسمی باتیں ہوئیں۔نجف نے زہرہ آپا کی صحت کی تازہ ترین صورتحال پوچھی اور حق نے مختصر،پیشہ ورانہ انداز میں اسے جواب دیا۔مگر اس گفتگو کی تہہ میں ایک تناؤ موجود تھا جو دونوں ہی محسوس کر رہے تھے۔کچھ دیر بعد،حق کا لہجہ یکلخت بدل گیا۔

"آپ کو سقراط سے شادی نہیں کرنی چاہیے۔"

نجف نے رخ موڑ کر حق کے چہرے کو دیکھا،مگر وہ خاموش رہی۔حق نے بات کو مزید آگے بڑھایا۔

"کسی مرتے ہوئے انسان کی خواہش یا ضد پوری کرنے کے لیے...اپنی پوری زندگی کیوں برباد کی جائے؟ مانا وہ مریضہ ہیں،جذباتی ہیں، وہ اس وقت اپنی ہوش میں نہیں ہیں مگر آپ تو ایک ڈاکٹر ہیں۔اور سقراط؟ وہ آپ کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکتا ہے۔وہ ماضی نہیں بھولا اور ہم سب سے بدلہ لینے کے لیے یہ شادی کر رہا ہے۔"

حق اپنی طرف سے ایک ہمدرد کی طرح اسے سمجھا رہا تھا،اور نجف خاموشی سے بغیر کسی ردِعمل کے اس کی باتیں سنتی رہی۔اس کا چہرہ بالکل سپاٹ اور غیر جانبدار رہا۔

جب حق اپنی بات مکمل کر چکا اور فضا میں کچھ دیر کے لیے سکوت چھا گیا تو نجف نے ایک گہرا اور ٹھنڈا سانس لیا۔اس نے اپنی گردن کو تھوڑا سا موڑا۔

"میرا خیال ہے حق...تمہیں اس وقت سقراط کے بجائے اپنی ٹوٹتی ہوئی شادی پہ فوکس کرنا چاہیے...نہیں؟"

سکتہ! نجف کے یہ چند الفاظ حق کے چہرے پر کسی زوردار تھپڑ کی طرح پڑے۔
حق کا چہرہ ایک لمحے میں سرخ ہو کر فق ہو گیا۔اس کے تمام الفاظ،اس کا سارا فلسفہ اور ہمدردی کا خول نجف کے ان الفاظ سے بکھر کر رہ گیا۔ اس نے شدید ضبط اور خفت سے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے۔وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکا۔نجف نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے اپنے دوپٹے کو درست کیا۔وہ آگے بڑھی،لان کی طرف گئی جہاں کامل کھیل رہا تھا۔اس نے جھک کر کامل اور باقی بچوں کو پیار کیا اور پھر حق کی طرف دیکھے بغیر،اپنے تیز قدم اٹھاتی ہوئی اندر کی طرف روانہ ہو گئی۔حق بزدار پیلس کے اس لان میں کرسی پر ویسے ہی ساکت بیٹھا رہ گیا۔نجف کا تیر نشانے پر لگا تھا۔حق کی اپنی شادی شدہ زندگی اس وقت تباہی کے دہانے پر کھڑی تھی،اور اس کے اپنے زوال اور بربادی کی خبر اب پورے خاندان میں کسی ڈھنڈورے کی طرح پھیل چکی تھی۔جو شخص اپنا گھر نہیں بچا سکا تھا،وہ آج نجف کو زندگی سنوارنے کا درس دینے چلا تھا۔جانے کتنی دیر تک وہ وہیں بیٹھا رہا۔اسے سینے کے مقام پر شدید جلن کا احساس ہوتا رہا۔

☆...☆...☆

جمعے کی نماز ختم ہوئے ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی۔بزدار ہسپتال کی راہداریوں میں معمول کے مطابق مریضوں اور تیمارداروں کی آمد و رفت جاری تھی،مگر کارڈیک بلاک کے ایک پرائیویٹ کمرے کے باہر آج ایک ایسی خاموشی پہرہ دے رہی تھی جو اس عمارت کی تاریخ میں پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھی۔یہ بزدار ہسپتال کی تاریخ کا پہلا نکاح تھا...جو آئی سی یو میں ہونے جا رہا تھا۔نہ کہیں پھول تھے...نہ قہقہے...نہ مبارک بادوں کا شور...نہ کسی دلہن کے ہاتھوں کی چھنکتی چوڑیاں...اور نہ ہی کسی دلہے کے چہرے پر مسکراہٹ۔یوں جیسے دو زخمی روحوں کا نکاح ہونے جا رہا ہو۔

بزدار خاندان میں سے کوئی بھی نہیں آیا۔حق ویسے ہی یہاں ڈیوٹی پہ تھا۔امجد بزدار صرف نکاح کی چند گھڑیوں کے لیے آئے تھے۔البتہ ثالث آیا تھا وہ بھی پورے دل سے اور وہ خوش بھی تھا۔شبگیر خاندان میں سے بھی دادی اور نامرہ نہیں آئی تھیں۔سرمد صاحب مجبوراً وہاں موجود تھے۔بستر پر تکیوں کا سہارا لیے زہرہ بیگم بیٹھی تھیں۔ان کا چہرہ ابھی تک زرد تھا،ہونٹوں پر خون کی رمق باقی نہ تھی،ہاتھ میں ڈرپ لگی ہوئی تھی مگر آج کئی دنوں بعد ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی روشنی اتر آئی تھی۔

امید کی روشنی...شاید اطمینان کی... یا شاید اس دعا کی، جس کے پورا ہونے کا وہ برسوں سے انتظار کر رہی تھیں۔ان کے ساتھ دوسری جانب سرمد صاحب بیٹھے تھے۔

ان کے عین سامنے دو سادہ کرسیاں رکھی تھیں۔ایک پر سقراط شبگیر بیٹھا تھا۔دوسری پر نجف بزدار۔دونوں نے سفید لباس پہن رکھا تھا۔نجف کا سفید سوتی سوٹ کسی دلہن کا لباس نہیں تھا وہ بس سادہ سا عام جوڑ تھا۔ اس کے سر پر سفید دوپٹہ تھا،مگر اس نے ایک لمحے کے لیے بھی نظریں نہیں اٹھائیں۔ادھر سقراط بھی سفید شلوار قمیض میں ملبوس تھا۔اس کے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے تھے۔اس کے چہرے پر وہی پرانی سپاٹ خاموشی تھی مگر گردن کی ابھری ہوئی رگیں بتا رہی تھیں کہ اس خاموشی کے نیچے کیسا قیامت خیز طوفان دفن تھا۔
کمرے میں موجود لوگوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی۔ سلال،سقراط کے عقب میں کھڑا تھا۔اس کے دونوں ہاتھ اپنے سامنے بندھے ہوئے تھے۔
نجف کے پیچھے ثالث بزدار کھڑا تھا۔وہ اس پورے کمرے میں واحد شخص تھا جس کے دل میں اس نکاح کے لیے کوئی کدورت نہیں تھی۔اس کی آنکھوں میں نمی ضرور تھی...لیکن اس نمی کے پیچھے خوشی بھی موجود تھی۔

امجد بزدار اندر نہیں آئے تھے۔ انہوں نے دروازے کے باہر کھڑے ہو کر مختصر الفاظ میں اجازت دی...حق ان کے ساتھ ہی تھا۔دادی... نامرہ...اور بزدار خاندان کے باقی افراد...کوئی بھی وہاں موجود نہیں تھا۔کمرے کی خاموشی مزید گہری ہو گئی۔

قاضی صاحب نے اپنی عینک درست کی،رجسٹر کھولا اور خطبہ پڑھنا شروع کیا۔مشینوں کی بیپ کے ساتھ قاضی کی عربی آیات فضا میں گھلنے لگیں۔قاضی صاحب نے پہلے نجف کی طرف رخ کیا۔

"نجف بزدار بنتِ امجد بزدار۔۔۔کیا آپ کو سقراط شبگیر ولد ضیاء شبگیر،اپنے حقِ مہر کے عوض اپنے نکاح میں قبول ہیں؟"

کمرے میں سانسیں رک گئیں۔نجف کی نظریں رجسٹر کے سفید صفحے پر جم گئیں۔

"آپ کو یہ نکاح اپنی خوشی اور رضا سے قبول ہے؟"

"سقراط شبگیر ایک ریپسٹ ہے۔سقراط نے مجھ سے زیادتی کی کوشش کی۔"

نشاط کے الفاظ نجف کی سماعت سے ٹکرائے۔ اس کے ہونٹ کھولے۔آواز نہیں نکلی۔
اس نے دوبارہ کوشش کی۔

"قبول ہے۔"

اس کی آواز اتنی مدہم تھی کہ شاید قریب کھڑے لوگ بھی پوری طرح نہ سن سکے۔
قاضی صاحب نے دوبارہ پوچھا۔

"نجف بزدار بنت امجد بزدار...کیا آپ کو یہ نکاح قبول ہے؟"

نجف کے گلے میں کانٹے اگ آئے۔اس نے نظریں اٹھائیں، زہرہ آپا اسے دیکھ رہی تھیں۔"میرا گھر سنبھال لو۔"اس نے اپنی آنکھیں سختی سے میچیں، ایک گرم آنسو اس کی پلک سے نکل کر گال پر ڈھل گیا۔اس نے اپنا دکھ نگل لیا۔

"قبول ہے۔"

نیمل نے آگے بڑھ کر نجف کے دونوں ہاتھوں کو تھام لیا۔

تیسری مرتبہ سوال دہرایا گیا۔نجف کو لگا جیسے وہ کسی بھیانک خواب کی تعبیر پر دستخط کر رہی ہے۔اس نے اپنی گردن کو تھوڑا سا جھکایا اور بوجھل دل کے ساتھ حتمی اقرار کیا۔"قبول ہے۔"

اب قاضی صاحب کی نظریں سقراط کی طرف اٹھیں۔تین بار اس سے یہی سوال پوچھا گیا اور سقراط نے بنا کسی ہچکچاہٹ کے تینوں بار واضح الفاظ میں "قبول ہے" بول دیا۔

"الحمدللہ! نکاح ہو گیا۔" قاضی صاحب کی آواز گونجی۔

دستخط کا مرحلہ مکمل ہوا۔ جیسے ہی قاضی صاحب نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے، ہسپتال کا وہ کمرہ ایک عجیب سے تقدس اور سکوت سے بھر گیا۔ زہرہ بیگم نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ دعا کے لیے اٹھائے۔ ان کی آنکھوں سے خوشی اور تشکر کے آنسو مسلسل بہہ کر ان کے گالوں کو بھگو رہے تھے۔ ان کے چہرے پر ایک ایسی تمانیت اور مسکراہٹ تھی جیسے انہوں نے وقت سے اپنی سب سے بڑی جنگ جیت لی ہو۔ انہوں نے انتہائی نقاہت سے اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھائے۔ سقراط اور نجف، دونوں اپنے اپنے دکھ، اپنی اپنی تکلیف اور نالاں تقدیر کا بوجھ اٹھائے، خاموشی سے آگے بڑھے اور زہرہ بیگم کے بستر کے قریب جھک گئے۔ زہرہ بیگم نے اپنا ایک ہاتھ سقراط کے جوڑے میں مقید سر پر رکھا اور دوسرا ہاتھ نجف کے سر پر۔

خاموشی سے بہتے آنسوؤں کے درمیان، بزدار اور شبگیر خاندان کی کئی سالہ ناراضی کی راکھ پر، سقراط شبگیر اور نجف بزدار کا نکاح قائم ہو چکا تھا۔ ایک ایسا رشتہ جس کی شروعات ہی درد، صدمے اور قربانی سے ہوئی تھی اور جس کی اگلی منزلیں اب غیب کے پردے میں پوشیدہ تھیں۔

نجف جب زہرہ بیگم کے سرہانے سے پیچھے ہٹی، تو نیمل، تارہ اور نوفہ آگے بڑھیں۔

سب سے پہلے نیمل نے بغیر کچھ کہے، نجف کو گلے لگایا۔ ایک بیٹی کا اپنی خالا کے لیے خاموش شکریہ تھا، جس نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی قربانی دے کر ان کی ماں کی خواہش کو پورا کیا تھا۔ تارہ اور نوفہ نے بھی باری باری نجف کو گلے لگایا۔ ان بچیوں کی آنکھوں میں آنسو تو اب بھی تھے مگر ان آنسوؤں میں اب خوف کی جگہ ایک ہلکی سی راحت اور امید چمک رہی تھی۔ اسی اثنا میں ثالث آگے بڑھا۔ اس کے چہرے پر ایک سچی اور دھیمی مسکراہٹ تھی جو پچھلے کئی دنوں کی پریشانی کے بعد پہلی بار ابھری تھی۔ اس نے نجف کے قریب آ کر، انتہائی محبت، احترام اور مان کے ساتھ نجف کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

"مبارک ہو... پھوپھو!" نجف کی آنکھیں بھر آئیں۔ جہاں باپ ناراض تھا، جہاں بڑے بھائی موجود تھے وہاں ساتھ دیا بھی تھا تو کس نے؟ ایک بائیس سالہ لڑکے نے... جسکے ماں باپ اسے شدید ناپسند کرتے تھے۔

دوسری طرف اب سقراط کے پاس سلال اور ثالث آئے۔ دونوں باری باری اس سے گلے ملے تھے۔ سقراط کے سپاٹ چہرے پر اگرچہ زبردستی کی کوئی مسکراہٹ نہیں آئی، مگر اس کے شانے سلال اور ثالث کے اس لمس سے قدرے ڈھیلے پڑ گئے تھے۔

"میری پھوپھو کا خیال رکھیے گا۔ انہوں نے پورے خاندان کو چھوڑ کر آپ سے شادی کی ہے۔" ثالث نے سقراط سے التجا کی تھی جس پر سقراط نے صرف سر ہلایا تھا۔ بے اختیار اسکی نظر نجف کی جانب اٹھی۔ کبھی وہ ہزار ارمانوں کے ساتھ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اور آج؟

آج وہ اسکی بیوی بن چکی تھی مگر دل میں کوئی خوشی کی رمک نہیں تھی۔ وہ زہرہ بیگم کی کسی بات پہ ہولے سے مسکرائی تھی۔ سقراط نے گہرا سانس لیتے رخ موڑ لیا۔ محبت باقی تھی یا نہیں لیکن سانس روکنے کی صلاحیت وہ آج بھی رکھتی تھی۔

کچھ ہی دیر میں، باہر کا ماحول بالکل بدل گیا۔ سلال اور ثالث نے جا کر بلاک کے پورے عملے میں شادی کی مٹھائی بانٹ رہے تھے۔ ڈیوٹی پر موجود نرسیں، وارڈ بوائز اور یہاں تک کہ آئی سی یو کے باہر موجود دیگر ڈاکٹرز، جو پچھلے کئی دنوں سے زہرہ بیگم کی نازک صورتحال کے باعث تناؤ کے عالم میں تھے، اس غیر متوقع مٹھاس اور مبارکباد کے تبادلے پر مسکرا اٹھائے۔ سفید، بے رنگ کوریڈورز میں گلاب جامن اور چھوہاروں کی خوشبو پھیل گئی اور ہسپتال کی وہ حبس زدہ فضا پہلی بار خوشگوار اور ہلکی پھلکی محسوس ہونے لگی۔ ثالث نے اپنا والا فون جیب سے نکالتے ہوئے، ماحول کی اس خاموش جھجک کو توڑنے کا فیصلہ کیا۔

"نہیں ثالث... تصویر کی کیا ضرورت ہے۔" نجف نے دھیرے سے معذرت کرنی چاہی۔

"تصویر تو بالکل بنے گی نجف... میری خاطر!" زہرہ بیگم نے مسکراتے ہوئے نرمی سے نجف کا ہاتھ تھام لیا۔ سقراط خاموشی سے بستر کے دائیں جانب، زہرہ بیگم کے تھوڑا قریب ہو کر کھڑا ہو گیا جبکہ نجف دوسری جانب، زہرہ بیگم کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے بیٹھ گئی۔

"ریڈی... تھری، ٹو، ون!"

ثالث کے فون کا فلیش چمکا۔ تصویر کے فریم میں، وسط میں زہرہ بیگم تھیں جن کے چہرے پر فتح، دعا اور اطمینان کی مسکراہٹ چمک رہی تھی۔ اور ان کے دونوں طرف سقراط اور نجف کھڑے تھے۔ ایک دوسرے سے نظریں چرائے، خاموش، جھجک میں لپٹے ہوئے مگر ایک دوسرے کے مقدر کے ساتھ ہمیشہ کے لیے جڑے ہوئے۔ یہ بزدار ہسپتال کی کئی دہائیوں پر محیط تاریخ میں آج کا دن ایک ایسا موڑ تھا جسے آئندہ کئی برسوں تک ہسپتال کا عملہ بھول نہیں سکتا تھا۔

☆...☆...☆

جاری ہے۔